جلد دوم

فیضانِ معرفت

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

مرتب

محمد زبیر

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

فیضانِ معرفت

جلد دوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم / بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب محمد زبیر استاذ الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم / بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نام کتاب : **فیضانِ معرفت** جلد دوم

افادات : **حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی** دامت برکاتہم
بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم ، بنگلور
وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب : **محمد زبیر** استاذ الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم ، بنگلور

صفحات : ۲۳۴

تاریخ طباعت : شوال المکرم ۱۴۳۵ھ

ناشر : **مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور**

موبائل نمبر : **9036701512** / 09634830797

ای میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

اجمالی فہرست

فہرستِ مضامین

عناوین ●●●●●●●●●●●●●● صفحہ

ہم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں

حقیقتِ طہارت
یعنی اسلام میں پاکی صفائی کی حقیقت

محبتِ الٰہیہ اور اس کے آثار ولوازم

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے تقاضے

محبت وخشیت کے آنسو

اللہ تک پہنچنے دنیا چھوڑنا ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نتیجۂ فکر: حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب شعیب مفتاحی دامت برکاتہم

الٰہی! میں تجھ سے دعا مانگتا ہوں	سبھی کے لیے میں بھلا مانگتا ہوں
گنہ گار ہوں میں سیاہ کار ہوں میں	ترا فضلِ بے انتہا مانگتا ہوں
کرم پر جو تیرے، بھروسہ ہے مجھ کو	خطا کر کے پھر بھی عطا مانگتا ہوں
تو ناراض ہو گر جیوں گا میں کیوں کر؟	خدایا میں تیری رضا مانگتا ہوں
بھلا دوں سبھی کو میں خاطر سے اپنے	فقط یک غمِ دل رُبا مانگتا ہوں
میں نظروں سے اپنے گرادوں سبھی کو	میں توفیق ایسی بَجا مانگتا ہوں
مجھے یاد تیری میسّر ہو ہر دم	میں ایسی ہی خلوت سرا مانگتا ہوں
میں دنیا سے بیزار ہوں یا الٰہی!	بکھیڑوں سے ان سب رہا مانگتا ہوں
شعیبؔ اپنی ہستی فنا کردوں رب پر	اِسی کی میں اُس سے دواء مانگتا ہوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمۃ

الحمد لأ هلہٖ و الصلوۃ لأهلها ؛ اما بعد:

اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی مجالس کا مجموعہ ''فیضانِ معرفت'' کی جلد اول کو بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی، قلیل مدت میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا، جلد اول شائع ہو کر تقریباً دو سال کا عرصہ ہو گیا تھا، بہت سارے لوگ دوسری جلد کے منتظر تھے؛ لیکن درمیان میں حضرت والا کے تصنیف کردہ رسالوں کے مجموعے ''جواہر شریعت'' کی ترتیب میں مصروف ہونے کی وجہ سے دوسری جلد کے آنے میں تاخیر ہو گئی۔

اب اللہ تعالیٰ نے جلد دوم کو ترتیب دینے کی سعادت نصیب فرمائی۔ جلد اول کے مقابلہ میں جلد دوم کی ترتیب کچھ بدل دی گئی ہے، جلد اول میں ایک ہی جگہ، ایک مجلس کی تمام باتوں کو ایک موضوع کے تحت جمع نہیں کیا گیا تھا؛ بل کہ مجالس میں ہونے والی مختلف باتوں کو مختلف عناوین کے تحت منتشر طور پر جمع کیا گیا تھا؛ لیکن حضرت والا کے مشورے سے اِس جلد میں مجلس وار ایک موضوع سے متعلق تمام بیانات کو یکجا کر دیا گیا ہے، نیز اس جلد میں حضرت والا کے تحریر کردہ بعض اہم اصلاحی مضامین کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ مثلاً ''محبتِ الٰہیہ''، ''محبت وخشیت کے آنسوں'' وغیرہ۔

اِن مجالس کے مجموعے کی ایک خوبی یہ ہے کہ حضرت والا نے اس پر ازاول تا

آخر نظر فرمائی ہے اور نہایت مفید اضافے فرما کر ترتیب کی خامی سے پیدا شدہ مضامین کی تشنگی کو دور فرما دیا ہے۔

نیز اپنے قیمتی مشوروں سے نواز کر احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجالس کی ترتیب کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ پہلی جلد کی طرح دوسری جلد کو بھی مقبولیت عطا فرمائے اور ان مجالس کی ترتیب کے سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے اور امت کو نفع پہنچائے اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

محمد زبیر استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم ربنگلور

۵ر ربیع الاول ۱۴۲۹ھ
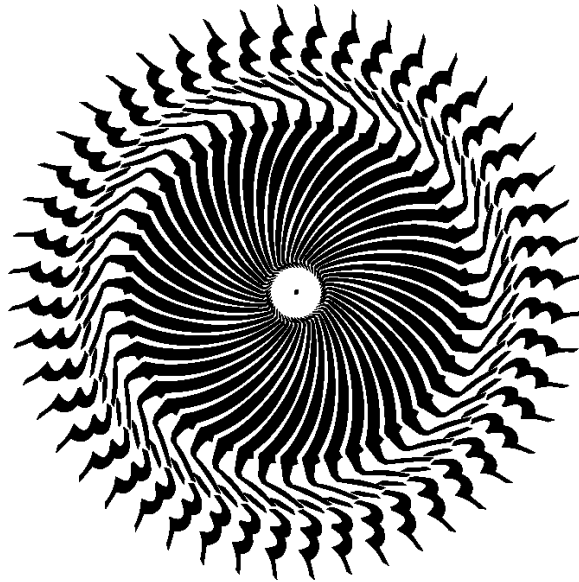
ہم آخرت
کے لیے پیدا کیے
گئے ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں

الحمدللّٰہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین الطفیٰ أمابعد:

فقد قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم : "إِنَّ الدُّنیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَإِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلاٰخِرَۃِ" (أو کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ ایک مختصر حدیث ہے اور یہ حدیث عام طور پر جمعہ کے خطبوں میں بھی پڑھی جاتی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے بنائے گئے ہو"۔

(شعب الإیمان:۷/۳۶۰)

دنیا ہمارے لیے اور ہم آخرت کے لیے

دنیا تو ہمارے لیے ہے؛ لیکن ہم آخرت کے لیے ہیں، اگر یہ مضمون ہم سب کو یاد ہو جائے، تو اس مضمون کی روشنی میں زندگی گزارنا آسان ہو جائے گا۔ آج لوگ بہت پریشان رہتے ہیں اور بار بار اس پریشانی کے نتیجے میں کہیں اِدھر، کہیں اُدھر بھٹکتے ہی رہتے ہیں اور یہ سب اس لیے ہے کہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، جو آدمی یہ کہہ کر آزاد ہو گیا کہ دنیا میرے لیے ہے اور میں خود آخرت کے لیے ہوں، تو وہ آدمی بھٹک نہیں سکتا اور اس کے لیے زندگی گزارنے میں بڑی آسانیاں ہیں۔

دنیا میں ہمیشہ رہنے کا خیال نہیں ہونا چاہیے، جو آدمی ہمیشہ دنیا میں رہنے کے خیال میں رہتا ہے، بڑی بڑی بلڈنگیں بناتا ہے، بے ضرورت چیزوں میں دل لگاتا

ہے اور دنیا کا سامان جمع کرتا رہتا ہے اور اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ مجھے یہ سب کچھ چھوڑ کر جانا ہے، تو اسے سکون کی زندگی مل ہی نہیں سکتی۔ چند دن پہلے ایک صاحب کے یہاں جانا ہوا، انہوں نے ایک عالی شان گھر بنایا ہے، میں نے کہا کہ بھائی جیسا بھی گھر بنائیں؛ لیکن جائیں گے کہاں؟ قبر ہی کے اندر، جیسا بھی گھر بنالو، جیسی بھی بلڈنگ بنالو، کتنی ہی عظیم الشان بنالو، ہر قسم کی راحت کا انتظام کرلو اور عیش وراحت کی سب چیزیں جمع کرلو؛ لیکن جب مریں گے، تو بادشاہ بھی وہیں جائے گا اور فقیر بھی وہیں جائے گا، وہاں فقیر یا بادشاہ کا کوئی فرق نہیں ہوگا۔

اور بعض لوگوں نے فرق کرنے کی کوشش کی تھی، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسے عجیب اور انتہائی عبرت ناک واقعات دکھا دیے کہ لوگوں نے ہمیشہ کے لیے سیکھ لیا۔

ایک جگہ پر ایک بزرگ کی مزار کے پاس ایک پیر رہتا تھا اور عام طور پر لوگ اس کے ساتھ ان مقامات کو ''شریف'' کہتے ہیں، جیسے ''کلیر شریف'' گلبرگہ شریف، ''اجمیر شریف'' وغیرہ اور بعض لوگوں میں ''شریف'' لگانے کی یہ عادت بیماری کی حد تک ہوتی ہے کہ ہر چیز میں شریف لگا دیتے ہیں۔

بھوک شریف - ایک لطیفہ

اس پر ایک لطیفہ یاد آگیا کہ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہی رحمہ اللہ ایک سفر کے دوران ایک جگہ گئے، وہاں کسی بزرگ کا مزار تھا اور کچھ مجاورین رہتے تھے، تو وہاں کے لوگ ہر چیز میں شریف لگا رہے تھے، حضرت! لیجیے لوٹا شریف، یہ کیجیے وضو شریف، ادھر ہے بیت الخلا شریف، سب جگہ شریف شریف۔

حضرت کو ہنسی بھی آرہی تھی؛ لیکن ہنسی روک کر اپنا کام کرتے رہے، جب نماز

وغیرہ سے فارغ ہو گئے ؛ پھر ان بزرگ کے مزار پر جا کر وہاں فاتحہ پڑھی، اس کے بعد واپس آئے ؛ تو ان لوگوں نے کہا کہ حضرت! کھانا شریف تیار ہے، اس لیے روٹی شریف کھا لیجیے، تو حضرت نے کہا کہ ''بھائی بھوک شریف نہیں ہے''، تو بعض جگہ شریف شریف کا استعمال بہت ہوتا ہے۔

ایک جھوٹے پیر کے قبر کی حالت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک ایسی ہی جگہ ایک صاحب مجاور تھے اور ان کے بہت سارے مرید تھے (اور جو اس قسم کے ڈھکوسلے لوگ ہوتے ہیں، وہ لوگوں کو حقائق سے آگاہ نہیں کرتے ؛ بل کہ گمراہ کرتے رہتے ہیں، تو) ان صاحب نے اپنے مریدین کو یوں گمراہ کر رکھا تھا کہ میں کبھی نہیں مروں گا، ہاں تھوڑی دیر کے لیے مجھے موت آئے گی، ظاہری موت ؛ لیکن جب مجھے قبر میں آپ لوگ دفنا دیں گے تو پھر میری وہاں زندگی شروع ہو جائے گی اور اس پیر نے کہا کہ جب میں مر جاؤں گا، تو چالیس دن کے بعد پھر واپس آؤں گا، تو ان کے مریدین نے کہا کہ حضرت! آپ کے لیے جو قبر شریف بنے گی وہ قبر شریف کیسی بنی چاہیے؟ تو انہوں نے کہا کہ اس میں ایسے ٹائلس لگاؤ اور یوں اس میں پینٹ لگاؤ، یوں زیب و زینت کرو اور اسی کے ساتھ اس میں ''اے سی'' بھی فٹ کرو۔ مریدین نے کہا کہ ہاں! ہم اسی طرح تیار کریں گے ؛ چناں چہ وہ صاحب ابھی موجود ہی تھے، زندہ ہی تھے، اسی وقت ان کے لیے قبر تیار کی گئی، سارے انتظامات کر دیے گئے، اور عالی شان قبر تیار ہو گئی، ٹائلس اور پھول و بوٹے سب لگائے و بنائے گئے، باہر سے تار کھینچ کر اس میں ''اے سی'' فٹ کی گئی۔

دیکھئے! اس کے مریدین کس قدر پکے تھے، اگر چہ شیخ کچا تھا، عام طور پر ایسا

دیکھنے میں آیا کہ سچے پیروں کے مرید بڑے کچے ہوتے ہیں اور کچے پیروں کے مرید بڑے پکے ہوتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کیا راز ہے؛ لیکن عام طور پر آج کل دیکھا ایسے ہی گیا ہے۔

اس کے بعد بہر حال وہ وقت، جو سب کو آنا ہے، اس کو بھی وہ وقت آ گیا، یعنی موت کا وقت، جب وہ مر گیا تو اس کے مریدین نے اس کو نہلایا، دُھلایا، اور لے جا کر دفن کر دیا، دفن کرنے کے بعد ''اے سی'' بھی چالو کر دیا؛ تا کہ اندر حضرت کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگے۔ اس کے بعد انتظار شروع کر دیا کہ حضرت تشریف لائیں گے؛ لیکن وہ تشریف کب لاتے؟

بہت دن ہو گئے، تو اس کے بعد ان لوگوں نے آپس میں کہا کہ بھائی! پیر صاحب نے چالیس دن میں واپس آنے کا وعدہ کیا تھا؛ مگر چالیس دن ہو چکے ہیں، ابھی تک نہیں آئے، کیا بات ہے، ذرا خبر تو لے لیں؟ مشورہ کیا گیا اور قبر کو کھولنے کی بات تجویز کی گئی۔ پیر صاحب کی وہ قبر ایسی بنائی گئی تھی کہ قبر کے اوپر ایک دروازہ بنایا گیا تھا تا کہ آسانی سے کھولا جا سکے، گویا کہ گھر ہی بنا دیا تھا۔ اب جب اس کو کھولا، تو عجیب و غریب تماشا نظر آیا، عذاب کی کیفیت نظر آئی، اور جو ''اے، سی'' انہوں نے فٹ کی تھی، جو کچھ ٹیلس وغیرہ لگائے تھے، اس کا تو اس میں نام و نشان نہیں تھا، وہاں تو کچھ اور ہی کیفیت اور حالت تھی، بس جناب عبرت ہوتی ہے۔

ایمان و عمل سے قبر کو بناؤ

الغرض! میں یہ کہہ رہا تھا کہ کیسا بھی آدمی دنیا میں آئے، جانا ہی ہے اور قبر کے گڑھے میں ہی رہنا ہے، کسی کے لیے کوئی عالی شان مکان نہیں بنایا جاتا، پھر جب وہاں پر جائے گا، تو اس کے ایمان و اعمال کے مطابق حساب و کتاب ہوگا۔ ہاں!

اچھے لوگ ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے قبر کو بڑی بہترین جگہ بنا دے گا، وہاں ان کے لیے ہر قسم کی راحت ہوگی۔ قبر کو مال کے ذریعہ بہترین ٹائلس اور پینٹ اور رنگ و روغن اور اے سی و فرنیچر سے بنایا نہیں جاتا؛ بل کہ قبر کو ایمان و اعمال سے بنایا جاتا ہے۔

اگر یہ پیر اللہ پر یقین رکھنے والا ہوتا، واقعی آخرت کا اس کو یقین ہوتا اور اللہ کی طرف سے ہونے والے سوالات پر اس کو یقین ہوتا، وہاں کی نعمتوں پر ایمان ہوتا، تو وہ آدمی کبھی یہ نہ کہتا کہ آپ لوگ میرے لیے ان ان چیزوں کا انتظام کرو، اس لیے کہ اگر اسے آخرت کی چیزوں پر یقین ہوتا، تو وہ کہتا کہ دنیا کی چیزیں کیا ہیں؟ اصل اے سی وہاں ہوگی، یہ دنیا کی اے سی کیا ہے؟ اصل نعمتیں تو وہاں ہوں گی، یہاں کی کیا نعمتیں ہیں؟ وہ ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ جن کو کسی انسان نے آج تک دیکھا نہیں ہے اور کسی انسان کے دل پر ان کا خطرہ بھی نہیں گزرا۔

ایسی ایسی چیزیں اللہ نے مسلمانوں کے لیے، مومنوں کے لیے تیار کی ہیں؛ چناں چہ اللہ تعالی نے قرآن میں فرمایا: ﴿فَلاَ تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدة:۱۷]

(نیک لوگوں کے لیے بطورِ جزا ایسی ایسی چیزیں تیار رکھی گئی ہیں کہ کسی نفس کو اس کی خبر تک نہیں ہے)

تو جسے اس آیت پر یقین ہوگا وہ کہے گا کہ یہاں کی کوئی چیز مجھے نہیں چاہیے، مجھے تو وہاں کی چیز چاہیے۔

آخرت کی فکر و تیاری

بہر حال! یہ قصہ تو درمیان میں یاد آگیا، بتا یہ رہا تھا کہ ہر آدمی مرنے کے بعد

جاتا ہے قبر میں اور وہاں بادشاہ و امیر ہو، یا غریب و فقیر ہو، سب کے لیے یکساں نظام ہے، اسی مٹی میں سب کو جا کر سونا ہے، اس لیے ہمیں آخرت کے لیے ابھی سے محمد رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے متوجہ کیا اور فرمایا کہ ''إِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ'' (تم تو پیدا ہی کیے گئے ہو آخرت کے لیے) ہاں! ''إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ'' (دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے) لہٰذا تم ضرورت کے لیے اس دنیا میں سے کھاؤ، پیو، اس میں رہو، سہو اور اس کو استعمال کرو؛ لیکن اصل چیز جس پر توجہ دینی ہے وہ یہ ہے کہ میری ساری زندگی، میرا کھانا اور پینا اور میری ساری راحتیں سب کچھ اللہ کے لیے ہونا چاہیے اور آخرت کی تیاری کے لیے ہونا چاہیے۔

مولانا حکیم اختر صاحب رَحِمَهُ اللهُ کہتے ہیں کہ بھائی! ہم چاہے لندن میں ہوں یا پاکستان میں یا ہندوستان میں ہوں، زمین کے جس گوشے میں ہوں اور چاہے ہم کو کسی ملک کی نیشنلٹی (NATIONALITY) مل جائے؛ لیکن دنیا کے ہم نیشنل (NATIONAL) نہیں ہیں، ہماری سٹیزن شپ (CITIZENSHIP) تو جنت کی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کی نیشنلٹی مل جائے، وہاں کسی کی نیشنلٹی مل جائے اور اس کے لیے پریشان ہو رہے ہیں، تگ ودَو ہو رہی ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے تو ہم کو وہاں کی نیشنلٹی دے کر بھیج دیا ہے؛ اس لیے ہم کو تو وہاں کی تیاری کرنی ہے اور ہم وہاں کے باشندے بنے رہیں، اس کی فکر زیادہ ہونا چاہیے۔

ایک دن ہم کو دنیا سے ضرور جانا ہے، خواہ ہماری بلڈنگ دو ہزار گز کی ہو، بعض رئیس ہمارے یہاں ایسے ہیں کہ دو دو ہزار گز کی بلڈنگ میں رہتے ہیں؛ مگر آخر میں ان کو زمین کے نیچے دو گز کی قبر ملتی ہے؛ البتہ جو نیک لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو تاحدِ نظر جہاں تک کہ ان کی نظر جا سکتی ہے وہاں تک کشادہ فرما دیں گے۔

قبر میں فرشتوں کے سوالات

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ جب بندے کو دفن کیا جاتا ہے، دو فرشتے جن میں سے ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نام نکیر ہوگا اللہ کی طرف سے آتے ہیں، ان فرشتوں کی حالت بڑی خطرناک قسم کی ہوتی ہے، ان کی شکلیں اور صورتیں آدمی دیکھے تو گھبرا جائے، کالی رنگت اور آنکھیں نیلی، کس قدر رڈراؤنی شکل ہوگی!! آواز ان کی بڑی گرج دار ہوتی ہے، ہاتھ میں ان کے گُرز ہوتے ہیں، وہ ان کو لے کر آتے ہیں اور آدمی سے سوال کرتے ہیں۔

وہ سوال کیا ہوتا ہے؟ ''مَنْ رَّبُّکَ'' ؟ (تیرا رب کون ہے؟) دوسرا سوال یہ ہوگا ''مَا دِیْنُکَ'' ؟ (تیرا دین کیا ہے؟) اور تیسرا سوال ہوگا ''مَنْ ھٰذَا الرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِیْکُمْ '' ؟ (یہ آدمی کون ہے، جو تم میں بھیجا گیا تھا؟)، ان کو پہنچانتے بھی ہو یا نہیں؟ مؤمن اس کو صحیح صحیح جواب دے دے گا، فرشتے کہیں گے کہ ہم جانتے تھے، تو تو ایسا ہی جواب دیے گا؛ پھر آسمان سے ایک منادی آواز دے گا کہ میرے بندے نے سچ کہا، اس کے لیے جنت کا بچھونا لگاؤ اور جنت کا اس کو لباس پہناؤ اور جنت کی جانب دروازہ کھول دو؛ نیز اس کے لیے تاحدِ نظر قبر کو وسیع کر دیا جائے گا۔ جب اس کے لیے یہ سب انتظامات ہوں گے، تو وہ آدمی خوشی میں کہہ اُٹھے گا کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس جا کر ان کو ان باتوں کی خبر دینا چاہتا ہوں؛ مگر فرشتے اس سے یہ کہیں گے کہ ''نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ'' (کہ دلہے یا دلہن کی طرح سو جا) اب تجھے اللہ کے سوا کوئی نہیں جگائے گا اور اگر وہ مرنے والا کافر یا منافق ہوگا، تو جواب میں ہائے ہائے کہے گا اور کہے گا کہ میں کچھ نہیں جانتا، لوگ جو کہتے تھے میں بھی وہی الٹی سیدھی کہہ دیا کرتا تھا۔ آسمان سے آواز آئے گی کہ اس نے

جھوٹ کہا ہے اس کو جہنم کا لباس پہناؤ اور آگ کا بچھونا لگا دو اور دوزخ کی طرف دروازہ کھول دو؛ نیز اس کے لیے قبر کو اس قدر تنگ کردیا جائے گا کہ اس کی ایک جانب کی پسلیاں دوسری جانب کی پسلیوں میں گھس جائیں گی۔

(مسند أحمد: ۴ / ۲۶۷ ، مصنف ابن أبي شيبة: ۳/۵۴)

غور کرو! قبر کی منزل کس قدر قابلِ عبرت ہے؟ اگر ایمان وعمل ہوگا تو اس کے لیے قبر جنت ہے، ورنہ قبر جہنم ہے۔

رابعہ بصریہ رحمہا اللہ کا فرشتوں سے مناظرہ

ہاں اللہ کے نیک بندوں کے لیے وہاں کوئی پریشانی وگھبراہٹ نہ ہوگی۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ مؤمن کو جب قبر میں بٹھایا جائے گا، تو "یجلس غیر فزع و مشغوب" (وہ اٹھ بیٹھے گا اس حال میں کہ وہ نہ خوف کھائے گا اور نہ پریشان ہوگا)۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ کا جب انتقال ہوگیا، کسی کے خواب میں وہ آئیں، خواب دیکھنے والے نے پوچھا کہ آپ کا انتقال ہوگیا تھا، اللہ کے پاس کیسے گذری؟ تو کہا کہ جب مجھے دفن کیا گیا، تو فرشتے آئے، پوچھنے اور سوال کرنے کے لیے، انہوں نے مجھ سے پوچھا "مَنْ رَّبُّکَ"؟ تو میں نے کہا کہ تم کون ہو؟ کہا کہ ہم اللہ کے فرشتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟ کہا کہ آسمان سے آئے ہیں، میں نے پوچھا کہ آسمان یہاں سے کتنی دوری اور فاصلہ پر ہے؟ تو کہا کہ پانچ سو برس کا فاصلہ ہے، آدمی کی رفتار سے یہاں کوئی چلے، تو پانچ سو برس میں آسمانِ اول پر پہنچے گا، (ہاں! فرشتے کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے، اس لیے وہ وہاں سے ایک لمحہ میں آجاتا ہے، وہ تو اس کو اللہ نے قدرت دی ہے) تو انہوں نے کہا کہ یہاں سے پانچ سو برس کا فاصلہ ہے،

تو میں نے کہا کہ اچھا تم کو معلوم ہے کہ تمہارا رب کون ہے؟ کہا کہ ہاں ہم کو معلوم ہے، میں نے کہا کہ جب پانچ سو برس کے فاصلہ کو طے کر کے تم خدا کو نہیں بھولے تو میں دو گز زمین سے نیچے آ کر اپنے رب کو کیسے بھول جاؤں گی؟

دیکھیے! اللہ کے نیک بندوں کا کچھ مقام بھی ہوتا ہے، وہ اللہ کے فرشتوں کو بھی ایسا جواب دے دیتے ہیں جو ''لاجواب'' ہوتا ہے۔

ایک نحوی عالم کا لطیفہ

مجھے ایک اور لطیفہ یاد آ گیا، عربی جاننے والوں کے لیے یہ لطیفہ سناتا ہوں، ہاں! جو عربی نہیں جانتے، ان کو مزہ نہیں آئے گا، مزہ کیا، سمجھ میں بھی نہیں آئے گا؛ لیکن یہاں اہلِ علم حضرات بھی ہیں اور طلبۂ کرام بھی ہیں؛ اس لیے عرض کرتا ہوں: وہ یہ کہ مظاہر علوم سہارنپور میں ایک استاد بزرگ تھے اور وہ نحوی تھے، فنِ نحو میں ان کو بڑی مہارت تھی، وہ ہر بات میں نحو کو سامنے رکھ کر کلام کرتے تھے، جب ان کا انتقال ہوا، تو طلبہ آپس میں کہنے لگے کہ حضرت کے پاس فرشتے آئے ہوں گے منکر نکیر اور انہوں نے حضرت سے پوچھا ہوگا ''مَنْ رَّبُّکَ''؟ (تیرا رب کون ہے؟) تو انہوں نے جواب میں کہا ہوگا ''مَنْ رَّبُّکَ''؟ (وہ جو تیرا رب ہے)

یعنی فرشتوں کے سوال میں ''من'' استفہامیہ ہے اور جواب کے اندر ''من'' موصولہ ہے، تو بظاہر سوال بھی وہی جواب بھی وہی، مگر معنی بالکل الگ، زندگی میں ان کا جو طریقہ تھا اس کو سامنے رکھ کر طلبہ آپس میں یہ کہہ رہے تھے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ اللہ کے منکر نکیر فرشتے آتے ہیں، سوال و جواب ہوتا ہے۔ جب نیک بندہ جواب دے دیتا ہے، اس کی قبر کو تاحدِ نظر وسیع کر دیا جاتا ہے۔ اور جب آدمی برا ہوتا ہے، تو اس کی قبر کو تنگ کر دیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قبر کے خوف سے رونا

اسی لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کسی قبر کو جب دیکھتے، قبر پر کھڑے ہوتے، تو بہت رویا کرتے تھے، حتی کہ آپ کی ڈاڑھی تر ہو جاتی، لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ جنت و دوزخ کے ذکر پر اس قدر نہیں روتے، جتنا کہ قبر کو دیکھ کر روتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، جو یہاں کامیاب ہو گیا اس کے لیے اگلی منزلیں اس سے زیادہ آسان ہوں گی اور جو اس سے نجات نہیں پایا اس کے لیے اس کے بعد کی منزلیں اور زیادہ مشکل ہوں گی؛ نیز فرمایا کہ **ما رأيتُ منظراً قطُّ إلّا والقبر أفظع منه**" (میں نے قبر سے زیادہ بھیانک کوئی منظر نہیں دیکھا)۔

(ترمذي: ۲۳۰۸، ابن ماجه: ۴۲۶۷، مسند أحمد: ۴۵۴، مستدرک حاکم: ۱/۵۳۶)

بہر حال! قبر ایک بھیانک جگہ ہے، اگر اس کو ایمان و عمل سے تیار نہ کیا گیا، اسی تیاری کے لیے ہمیں یہ دنیا دی گئی ہے، دنیا عیش و عشرت کے لیے نہیں ہے، بل کہ ایک عبرت کا مقام ہے اور یہ حقیقت قبر میں جا کر کھلے گی، مولانا حکیم اختر صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ایک شعر میں دنیا کی حقیقت بیان کی ہے، ان کا شعر ہے ؎

یوں تو دنیا دیکھنے میں کس قدر خوش رنگ تھی
قبر میں جاتے ہی دنیا کی حقیقت کھل گئی

یہاں سے لوگ جب جائیں گے، تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کی حقیقت کیا ہے؟ دنیا خاک نظر آئے گی۔

افلاطون کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات

مجھے اس پر ایک قصہ یاد آ گیا، بڑا عجیب وغریب قصہ ہے اور یہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ افلاطون جو بہت بڑا حکیم اور اپنے زمانے کے بڑے عقلمند لوگوں میں شمار ہوتا ہے اور وقت کا بہت بڑا فلسفی تھا اور اس کی تحقیقات دنیا میں آج بھی معتبر و مستند مانی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا تھا، اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جنگل میں ایک معمولی جھونپڑے میں رہتا تھا، لوگوں سے میل ملاپ نہیں رکھتا تھا، اگر کسی کو اس سے ملنا ہوتا، تو پہلے سے اجازت لینی پڑتی تھی، وہ اللہ کو تو مانتا تھا مگر رسولوں کو نہیں مانتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک دفعہ اس کی ملاقات بھی ہوئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ میں اللہ کا نبی ہوں میرے اوپر ایمان لاؤ۔ تو اس نے کہا کہ میرا ایک سوال ہے، وہ یہ کہ فرض کیجیے کہ اللہ تعالیٰ تیر پھینک رہا ہے اور بندوں کی جانب پھینک رہا ہے اور بندے اس کا نشانہ ہیں اور اللہ کے تیر یہ مصیبتیں اور پریشانیاں، بیماریاں وحادثات ہیں، اگر بندے اللہ تعالیٰ کے ان تیروں سے بچنا چاہیں تو کیا طریقہ ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے سوال پر فی البدیہ جواب دیا کہ تیر پھینکنے والے کی بغل میں بیٹھ جاؤ، اس لیے کہ تیر پھینکنے والا تو سامنے تیر پھینکے گا، اپنی بغل میں نہیں پھینکے گا۔ مطلب یہ تھا کہ اللہ کے قریب ہو جاؤ، جو اللہ کے قریب ہو جائے گا اُسے تیر کیسے لگے گا؟ اور جو دور رہے گا ظاہر ہے کہ اسے تیر لگے گا۔ جب یہ جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا کہ ایسا فی البدیہ جواب تو شاید دنیا میں کوئی دے نہ سکے اور کہا کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں، میں مانتا ہوں؛ لیکن آپ جاہلوں کے لیے ہیں،

آپ کی مجھے ضرورت نہیں؛ کیوں کہ میں تو بڑا عقلمند اور فلسفی ہوں۔

دنیا کی حقیقت۔ افلاطون کی نظر میں

الغرض! ایک مرتبہ اس زمانے کا بادشاہ اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ اس سے ملنے جنگل گیا، ملاقات ہوگئی اور بادشاہ نے سوال کیا کہ آپ یہاں جنگل میں رہتے ہیں، مگر یہاں آپ کے پاس کھانے اور پینے کی کوئی چیز بھی بظاہر نظر نہیں آتی، یہ کہتے ہوئے بادشاہ نے کچھ جملے ایسے استعمال کیے جس سے ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی حقارت کر رہا ہے۔ افلاطون کو یہ بات ناگوار گزری کہ دنیا کو یہ بہت کچھ سمجھتا ہے اور ہماری یہ حالت دیکھ کر ہم کو حقیر سمجھ رہا ہے، اس لیے افلاطون نے بادشاہ کو کچھ سبق پڑھانا چاہا؛ اس لیے افلاطون نے بادشاہ کے رخصت ہونے کے موقعے پر اس سے کہا کہ جناب! میری ایک گزارش ہے، وہ یہ کہ فلاں وقت آپ ہمارے یہاں تشریف لائیں میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں اور صرف آپ کی نہیں آپ کے تمام وزرا کی، ارکان دولت کی اور آپ کے مشیروں کی اور آپ کے فوجیوں کی، سب کی دعوت ہے۔

اس کی بات کا بادشاہ انکار بھی نہیں کرسکتا تھا؛ اس لیے اس نے افلاطون کی دعوت قبول کرلیا۔ اب جب وہ دعوت کا وقت آیا، تو اپنے پورے لشکریوں کے ساتھ، اپنے وزرا کے ساتھ، ارکان دولت کے ساتھ بادشاہ اس جنگل کی طرف چلنے لگا، جنگل کے قریب پہنچے، تو دور ہی سے سب کو نظر آ رہا تھا کہ یہاں سے وہاں تک عظیم الشان قسم کی بلڈنگیں ہیں، راستے بنے نظر آ رہے ہیں، بہترین انتظامات نظر آ رہے ہیں، جنگل میں منگل ہو گیا ہے، یہ دیکھ کر سب لوگ حیران رہ گئے کہ چند دنوں کے اندر اتنی بلڈنگیں یہاں کس نے بنادی ہیں، یہ راستے کس نے بنا دیے ہیں، اتنا بہترین

انتظام کس نے یہاں کر دیا ہے۔ خیر! اب جو وہاں پہنچے، تو افلاطون کے لوگ وہاں استقبال کے لیے موجود تھے ،لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور لے جا کر ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر پہنچا دیا، دیکھا تو بادشاہ کے لیے مخصوص عمارت تھی، وزیروں اور مشیروں کے لیے الگ انتظام تھا؛ جب کھانے کا وقت آیا تو بہترین قسم کے کھانے پیش کیے گئے، سب نے کھانا کھایا اور خوب سیراب ہوئے اور جب رات کا وقت آیا تو سب لوگ آرام کرنے اپنی اپنی بلڈنگوں میں پہنچ گئے اور سو گئے ؛لیکن صبح اٹھے، تو دیکھتے ہیں کہ جنگل میں نہ کوئی بلڈنگ ہے، نہ کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی بچھونا ہے نہ اوڑھنا، کچھ بھی نہیں ہے، بالکل صاف جنگل ہے، سب کے سب جنگل میں نیچے پڑے ہوئے ہیں، اُدھر بادشاہ بھی نیچے پڑا ہوا ہے، اور اس کے وزیر بھی نیچے پڑے ہوئے ہیں، یہ دیکھ کر سب پریشان بھی ہوئے اور غصہ بھی ہوئے۔

افلاطون نے کہا کہ جو کچھ تم نے دیکھا تھا وہ دراصل میرے خیال کا نتیجہ تھا، قوتِ خیالیہ کا کرشمہ تھا، قوت خیالیہ سے آپ کے ذہنوں میں میں نے یہ بلڈنگیں ڈال دیں، یہ عجیب وغریب تماشہ آپ کو دکھا دیا، حقیقت میں کچھ نہیں تھا، میں نے تم کو یہ بتانا چاہا کہ جب تم آخرت میں جاؤ گے، تو یہ دنیا کی زیب وزینت، بلڈنگیں و عمارتیں جسے تم سب کچھ سمجھتے ہو، اسی طرح محض ایک خیالی صورتیں نظر آئیں گی۔

قوتِ خیالیہ کی حقیقت

یہ قوتِ خیالیہ بڑی عجیب وغریب چیز ہے، ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا ہو؛ اس لیے سن لیں کہ آج کی دنیا میں "مسمریزم" (MESMERISUM) کے نام سے یہ ایک فن چل رہا ہے، اسے "ہپناٹزم" (HIPNOTISUM) بھی کہتے ہیں، اس کے ذریعے ایسے بہت سارے کام انجام دیے جاتے ہیں، اس کو عربی

میں ”عمل التنویم“ کہتے ہیں۔

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ ہم ہپناٹزم کے ذریعے ایسا کر سکتے ہیں کہ ایک آدمی کو پانی دیں اور اس کے خیال میں یہ ڈالیں کہ تو شراب پی رہا ہے اور وہ یہ پانی پیے گا، تو اسے نشہ آئے گا؛ حالاں کہ وہ پانی پی رہا ہے، نشہ کیسے آسکتا ہے؟ یہ در اصل قوتِ خیالیہ کا کرشمہ ہے اور قوتِ خیالیہ تمام انسانوں میں ہوتی ہے؛ لیکن بعض لوگ اس کو قوت دیتے ہیں، ترقی دیتے ہیں، پروان چڑھاتے ہیں، تو بہت آگے تک پہنچ جاتی ہے اور ایسے لوگ کچھ عجیب وغریب چیزیں دکھانے لگتے ہیں، اسی کو تصرف بھی کہا جاتا ہے۔

قوتِ خیالیہ اور عاملوں کا دھوکہ

اور یہ عاملین کے یہاں بھی چلتا ہے، عاملین فال دیکھتے ہیں انجن کے نام سے، یہ بھی دراصل قوت خیالیہ کا اثر ہوتا ہے، لوگ اسے سمجھتے ہیں کہ کوئی حضرت والا تشریف لاکر غیب کی باتیں بیان فرما رہے ہیں، وہ ایسے ہی حضرت ہیں جیسے کہ وہاں افلاطون کے پاس لوگوں کو بلڈنگیں نظر آئی تھیں، کیا ان کی کوئی حقیقت تھی؟ نہیں! محض خیالات کا کرشمہ تھا، عامل لوگ معصوم بچوں اور بچیوں کے ذہن پر یہ ڈالتے ہیں کہ اس کو ”کاغذ“ پر یا ”پان“ پر کچھ صورتیں نظر آرہی ہیں اور یہ مؤکل ہیں، جو غیب کی باتیں جانتے ہیں؛ حالاں کہ یہ سب غلط اور جھوٹ ہے، یہ سب دراصل باہر کچھ نہیں ہوتا؛ بل کہ اس کے دماغ میں نظر آتا ہے۔

اب بچہ اس وقت عامل کے زیرِ اثر جب دیکھتا ہے، تو کہتا ہے کہ ہاں! مجھے ایک ڈاڑھی والے حضرت نظر آرہے ہیں، ایسا لباس پہنے ہیں، کچھ بول رہے ہیں، اب وہ عامل اس سے سن کر لوگوں کو سنا دیتا ہے کہ بات ایسی ایسی ہے۔

یہ سب کا سب محض ایک دھوکہ ہے، حقیقت کچھ نہیں؛ کیوں کہ ذرا غور کرو کہ اگر ان حضرت کو آکر کچھ بولنا ہی تھا، تو بچے سے ہی کیوں بولتے ہیں؟ خود اسی عامل سے کیوں نہیں بتا دیتے؟ اور یہ حضرت عامل کو کیوں نظر نہیں آتے، صرف بچے ہی کو کیوں نظر آتے ہیں؟ ذرا سوچ کر تو دیکھئے! بات یہ ہے کہ یہ عاملین بچوں سے یہ کام اس لیے لیتے ہیں کہ بچے کا ذہن بہت کمزور ہوتا ہے، کچا ہوتا ہے، قوتِ خیالیہ فوراً اس پر اٹیک(ATTACK) کرتی ہے اور اس کے برخلاف بڑے آدمی پر اثر ڈالنے کے لیے بڑی قوت چاہیے اور یہ آسان نہیں ہے؛ اس کے لیے افلاطون جیسے لوگوں کی قوت درکار ہوتی ہے، اتنی بڑی قوت ان عاملین بیچاروں کے پاس کہاں ہوگی؟ اس لیے چھوٹے چھوٹے بچوں کو استعمال کر کے لوگوں کو بہکاتے ہیں کہ حضرت آ رہے ہیں اور مؤکل آ رہے ہیں، فلاں یوں فرما رہے ہیں اور عوام لوگ ان کے پاس جا کر ان کی باتوں سے بہک جاتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ ہاں ضرور کوئی بات ہے۔

قوتِ خیالیہ کی ایک مثال سے وضاحت

قوتِ خیالیہ کو سمجھنے کے لیے ایک موٹی سی مثال دیتا ہوں، جو میں نے میرے حضرت شاہ مسیح الامت رَحِمَہُ اللّٰہُ سے سنی ہے، حضرت فرماتے تھے کہ قوتِ خیالیہ ہر ایک میں ہوتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ کبھی آپ آنکھ بند کر کے آنکھوں کو رگڑتے رہیے اور خیال جماتے رہیے، تو آپ کے خیال میں عجیب عجیب تماشے نظر آئیں گے، عجیب عجیب شکلیں نظر آئیں گی، تعجب انگیز رنگتیں سامنے آئیں گی، اور ایسی چیزیں دکھائی دیں گی کہ باہر ان کا کوئی وجود بھی نہ ہوگا، یہ ظاہر ہے کہ حقیقت میں کچھ نہیں ہے؛ بل کہ قوتِ خیالیہ ان چیزوں کو ہمارے ذہن میں بناتی ہے اور

جب یہی قوت بڑھتی ہے، تو دوسری طرف بھی یہ اثر انداز ہو جاتی ہے۔

اس کی ایک دوسری مثال یہ کہ ایک دریا ہے، دریا کے بیچ میں یا کنارے پر ایک دیوار ہے، بہت اونچی دیوار ہے اور دیوار کے دونوں طرف کو نیچے سے پانی بہہ رہا ہے اور دیوار پر چلنے کے لیے اچھا خاصا دو تین فیٹ کا راستہ بھی ہے؛ اگر اس راستے پر آپ کو چلنے چھوڑ دیا جائے، تو آپ اس پر آسانی سے چل سکتے ہیں یا ڈگمگانے لگتے ہیں؟ آپ سے اس پر آسانی سے چلا نہیں جا سکے گا؛ حالاں کہ وہاں راستہ تو ہے، جتنا آپ کو نیچے چلنے کے لیے راستہ چاہیے، اس سے کچھ بڑا ہی راستہ وہاں موجود ہے؛ لیکن آپ پریشان ہوتے رہیں گے اور ایسی حالت ہوگی کہ گرنے لگیں گے، بڑا سنبھل کر چلنا پڑے گا اور کبھی چکر آجائے گا، بہت سارے لوگ تو چل ہی نہیں سکتے۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ آخر یہاں ایسا ہوتا کیوں ہے؟ یہ چکر کیوں آرہا ہے؟ اور چلنے میں دشواری کیوں ہو رہی ہے؟ جب کہ پیروں میں پوری طاقت و قوت موجود ہے۔ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ دراصل یہ قوتِ خیالیہ کی وجہ سے ہوتا ہے، قوت خیالیہ بار بار اندر سے کہتی ہے کہ ''تو گر جائے گا، تو گر جائے گا'' یہ خیال بڑی مضبوطی سے دل پر دماغ پر سوار ہو جائے گا اس لیے گرنے لگتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قوتِ خیالیہ بڑی عجیب چیز ہے۔

الغرض! دنیا کی حقیقت سمجھانے کے لیے افلاطون کا واقعہ بیان کیا تھا کہ اس نے بادشاہ کو اپنی قوتِ خیالیہ سے بلڈنگیں اور زیب وزینت کی چیزیں دکھا کر یہ بتا دیا کہ دنیا کی حقیقت کچھ نہیں، محض ایک خواب ہے۔

پھر جب قوتِ خیالیہ کا ذکر آ گیا تو چونکہ لوگ اسے جانتے نہیں، اس لئے تھوڑی وضاحت کرنی پڑی۔

آخرت کتنی قریب ہے؟

آج لوگ یہ خیال کر کے کہ آخرت تو بہت دور ہے، بے جھجک گناہ کرتے رہتے ہیں اور دنیا سے ایسا دل لگا لیتے ہیں گویا انہیں مرنا ہی نہیں ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے یہاں آئے ہیں؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، دنیا میں کسی کو قرار نہیں ہے، دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہ کوئی آیا ہے نہ ہی آئے گا، دراصل قیامت کو دور تصور کرنے کی وجہ سے انسان غفلت کی زندگی گذارتا ہے؛ حالاں نکہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ "(میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں، یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کیا۔

(بخاري: ۴۶۵۲،مسلم: ۲۹۵۱، ترمذي: ۲۲۴۱ وغیره)

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کو اتنا قریب بتایا ہے جتنا کہ دو انگلیاں آپس میں ایک دوسرے کے قریب ہوتی ہیں کہ جتنا فاصلہ بیچ کی اور شہادت کی ان دو انگلیوں کے درمیان ہے، اتنا ہی میرے اور قیامت کے درمیان ہے۔

ایک اور حدیث یاد آگئی حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ" (جو آدمی مرجاتا ہے اس کی قیامت شروع ہوجاتی ہے) (حلية الأولياء : ۲۶۷/۶)

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آخرت اگر چہ دور ہو؛ لیکن انسان کے مرتے ہی اس کی قیامت شروع ہو جاتی ہے؛ کیوں کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، اس اعتبار سے بھی آخرت بہت قریب ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے پاس صرف بصارت ہے؛ اس لیے ہمیں آخرت دور نظر آتی ہے، انبیا کے پاس بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی ہوتی ہے، اس لیے ان کو آخرت قریب نظر آتی ہے، ہمیں بھی اگر بصیرت حاصل ہو جائے اور وہ ایمانی وروحانی آنکھیں مل جائیں، تو ہمیں بھی آخرت کی منزل قریب نظر آنے لگے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ صحابہ کرام کو دیکھا کہ وہ جھونپڑے کی مرمت واصلاح میں مشغول ہیں، یہ دیکھ کر آپ نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ ہم اس جھونپڑے کی مرمت واصلاح کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ " **وأما أن الأمر أعجل من ذلک**" آخرت تو اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ **(مسند أحمد: ۲/۱۶۱)**

سلیمان التیمی رحمہ اللہ کا واقعہ

حضرت سلیمان التیمی رحمہ اللہ ایک بڑے درجے کے محدث اور بزرگ گزرے ہیں، ان کے صاحبزادے حضرت معتمر بن سلیمان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہمارے والد کا ایک مکان تھا، جس میں وہ رہا کرتے تھے، وہ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے گر گیا، تو انھوں نے ایک خیمہ گاڑ لیا اور مرتے دم تک اسی میں رہے، لوگوں نے ان سے کہا کہ حضرت! آپ اس مکان کو کیوں نہیں بنا لیتے؟ تو فرمایا کہ معاملہ تو اس سے بھی زیادہ قریب ہے کہ موت آجائے۔ **(حلیۃ الأولیاء: ۳/۳۰)**

ادھر آنکھ بند ہوتے ہی نظر آجائے گا کہ جنت ہے، جہنم ہے، عذابات کا سلسلہ ہے، فرشتے ہیں وغیرہ، تو آنکھ بند ہونے میں کتنی دیر ہے بھائی؟ ایک سیکنڈ لگے گا؟ تو سمجھ لو کہ آخرت بھی اتنی ہی قریب ہے۔

ایک بات یہ بھی سمجھ لو کہ قیامت کو دور تصور کرنا دراصل کافروں کا نظریہ ہے؛

چناں چہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ﴿اِنَّھُمْ یَرَوْنَہٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰہُ قَرِیْبًا﴾ (بلاشبہ وہ (کفار) قیامت کو دور سمجھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں)[المعارج: ۶-۷]

قرآن کریم میں اس معنے کی اور بھی آیتیں دیگر مقامات پر موجود ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کو دور سمجھنا کفار کا نظریہ ہے؛ اسی لیے کفار دنیا میں عیش کر رہے ہیں، ان کو کوئی رکاوٹ نہیں ہے؛ لیکن مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ آخرت کو قریب تصور کر کے زندگی گذارتا ہے، اللہ سے ملاقات کا متمنی ہوتا ہے، جہنم کے خوف ناک مناظر اور جنت کے حسین مناظر ہر وقت اس کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

”اللہ سے ملاقات کا یقین“ نفسِ مطمئنہ کی صفت

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ایک دعا منقول ہے، جس میں آپ نے اللہ سے نفسِ مطمئنہ کا سوال کیا ہے، فرماتے ہیں: ”اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُکَ نَفْساً بِکَ مُطْمَئِنَّۃً تُؤْمِنُ بِلِقَائِکَ وَتَرْضٰی بِقَضَائِکَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِکَ“

(اے اللہ! میں آپ سے نفسِ مطمئنہ کا سوال کرتا ہوں، جو تیرے سے ملاقات کا یقین رکھتا ہو اور تیرے فیصلے پر راضی ہو اور تیری عطا پر قناعت کرے)

اس دعا میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نفسِ مطمئنہ کی تین صفتوں میں سے ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ سے ملاقات کا یقین رکھتا ہو۔ معلوم ہوا کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا پکا یقین نہیں رکھتا، اسے نفسِ مطمئنہ حاصل نہیں ہے۔ یقین کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک پکا یقین اور ایک کچا یقین؛ کچا یقین تو ہر مؤمن کو حاصل ہے؛ کیوں کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ ایک دن مرنا ہے، اللہ سے ملاقات کرنا ہے؛ لیکن ایسا کچا یقین ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، جیسا تھا ویسا ہی

ہے، اسی لیے ''امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ '' اپنی کتاب ''احیاء العلوم'' میں جہاں آخرت کا بیان ہے، لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہیں، جن کے دل کے اندر آخرت کا یقین گھس گیا ہو۔ (إحیاء العلوم: ۴/ ۵۱۱)

کچا یقین تو سب کو ہے؛ لیکن یہاں پکے یقین کا سوال ہے، اس لیے کہ جسے اللہ سے ملاقات کا پکا یقین ہوتا ہے، اس کی زندگی کا نقشہ الگ ہوتا ہے، وہ کبھی حرام کاموں میں مبتلا نہیں ہوگا، وہ کبھی فرائض کو پامال نہیں کرے گا، گناہوں کے قریب بھی نہیں جائے گا اور پکا یقین اسی وقت تسلیم بھی کیا جائے گا؛ جب کہ وہ اوامر کو بجالاتا ہو، نمازوں کا اہتمام کرتا ہو اور نواہی وممنوعات سے اپنے آپ کو بچاتا ہو۔ اگر یہ چیزیں اس کی زندگی میں نہ ہوں، تو اسے اللہ سے ملاقات کا پکا یقین نہیں ہے، اس لئے کہ آثار ہی سے نظریات وعقائد کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک بیٹا اپنے باپ کی نافرمانی کرے، تو آپ اس سے کہتے ہیں کہ ارے! وہ تو تمہارا باپ ہے باپ! یہ اس لڑکے سے کیوں کہتے ہیں؟ حالاں کہ آپ سے زیادہ وہ لڑکا جانتا ہے کہ وہ اس کا باپ ہے؛ لیکن آثار نہ ہونے کی وجہ سے آپ اس سے کہتے ہیں کہ وہ تمہارا باپ ہے؛ اس لیے کہ وہ جاننا بھی کیا جاننا جس میں جاننے کے آثار ولوازمات نہ ہوں۔

اسی طریقے پر سمجھیے اللہ سے ملاقات کا پکا یقین ہوگا، تو خود بخود زندگی کا نقشہ بدل جائے گا، حلال وحرام کی تمیز پیدا ہوجائے گی، اچھے اور برے کا فرق کرے گا۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا عجیب واقعہ

الغرض! مؤمن کو اللہ سے ملاقات کا ایسا پکا یقین ہوتا ہے کہ وہ آخرت کے مناظر کا دنیا ہی میں مشاہدہ کرتا ہے؛ جیسے ایک صحابی حضرت عمیر بن الحمام رضی اللہ عنہ کا

واقعہ ہے ۔جب رسول اللہ ﷺ نے جنگِ بدر میں مشرکین کو قریب ہوتا دیکھا، تو فرمایا کہ اس جنت کی طرف لپکو، جس کی چوڑائی زمین وآسمان کے برابر ہے، حضرت عمیر نے کہا کہ "بخ بخ "یعنی واہ واہ، آپ نے پوچھا کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا؟ تو عرض کرنے لگے کہ میں بھی ان لوگوں میں داخل ہونے کی امید وآرزو رکھتا ہوں، جو اس میں جانے والے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم بھی ان لوگوں میں ہو؛ پھر وہ اپنی تھیلی سے کھجوریں نکال کر کھانے لگے، پھر کہا کہ :

لَئِنْ أَنَا حَيِيتُ حَتّٰى آكُلَ تَمَرَاتِي هٰذِهِ إِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيلَةٌ "

(اگر میں ان میرے کھجوروں کو کھانے تک زندہ رہوں ،تو یہ بڑی لمبی زندگی ہے) یہ کہہ کر گئے اور لڑ کر شہید ہو گئے ۔

(مسلم: ۱۹۰۱ ،سنن بیهقي: ۹/۴۳، مسند أحمد: ۳/۱۳۶ ، طبقات ابن سعد :۳/۴۲۵، الإصابة : ۴/۵۹۴)

مطلب یہ کہ آخرت کا ایسا یقین تھا کہ کھجوروں کے کھانے تک کا وقت بھی ان کو اس دنیا میں زیادہ اور طویل لگ رہا تھا اور اس کے مقابلے میں ان کو جنت بالکل سامنے نظر آرہی تھی، گویا کہ وہ آنکھوں سے اسے دیکھ رہے ہوں۔

اللہ سے ملاقات کا یقین رکھنے والوں کا حال

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَهْ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ﴾

[الحاقة: ۲۰]

(جس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا آو! میرا نامۂ عمل پڑھ کر دیکھو کیسا ہے، مجھے پہلے ہی سے یقین تھا کہ میں اس حساب وکتاب کے مرحلے میں آکر اپنے پروردگار سے ملاقات کروں گا)

مطلب یہ ہوا کہ مجھے پہلے ہی سے ملاقات کا پکا یقین تھا، اسی لیے میں ویسے اعمال بھی تیار کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ پکا یقین رکھنے والے کے احوال واعمال بھی اچھے اور خوب ہوتے ہیں۔

عربی زبان میں "ظن" کے کئی معنے آتے ہیں اور یہاں لفظ "ظن" بمعنی یقین ہے اور ایک معنی "ظن" کے بدگمانی کے بھی آتے ہیں اور قرآن میں "ظن" کی مذمت اسی معنے کے لحاظ سے آئی ہے: ﴿ انَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ﴾ (بعض گمان گناہ بھی ہوتے ہیں) [الحجرات:۱۲]

ظن کو یقین کے معنے میں قرآن کریم میں ایک اور جگہ بھی استعمال کیا گیا ہے:

﴿وَاِنَّهَالَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ [البقرة:۴۵]

(اور بلاشبہ وہ (نماز) عام طور پر لوگوں کے لیے بڑی مشکل اور بوجھل چیز ہے؛ مگر خشوع وخضوع والوں کے لیے (بڑی آسان ہے) اور خاشعین وہ لوگ ہیں، جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور وہ اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)

دیکھئے! یہاں بھی اللہ سے ملاقات کا یقین رکھنے والوں کو خاشعین کہا گیا ہے، معلوم ہوا کہ جسے یقین ہوتا ہے، وہ نمازوں کا اہتمام کرتا ہے اور نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرتا ہے اور جو نمازوں کو خشوع وخضوع سے پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتا، گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا یقین رکھنے والا نہیں ہے۔

اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں: "ایک یہ کہ ملاقات سے مراد نماز میں اللہ سے ملاقات" کیوں کہ نماز بھی اللہ تعالیٰ سے ایک ملاقات اور اس سے مناجات ہی ہے۔ "دوسری تفسیر یہ ہے کہ ملاقات سے مراد آخرت میں قیامت کے دن اللہ سے ملاقات"

میں کہتا ہوں کہ دونوں مراد ہیں، دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، جو لوگ خشوع خضوع والے ہوتے ہیں، انہیں یہ یقین بھی ہوتا ہے کہ ہم نماز پڑھ رہے ہیں، تو نماز میں اللہ سے ملاقات ہو رہی ہے اور اسی کے ساتھ یہ ایمان و یقین تو ہے ہی کہ قیامت میں بھی اللہ سے ملاقات ہونے والی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں اللہ سے ملاقات کا یقین پیدا کرنے کے لیے نماز سب سے اعظم چیز ہے، اس لیے جسے ابھی ایسا یقین پیدا نہیں ہوا اسے چاہیے کہ نمازوں کا اہتمام کر لے، وہ یقین خود بخود پیدا ہو جائے گا اور جب یقین پیدا ہو جائے گا، تو وہ ہر کام میں سوچے گا کہ مجھے ایک دن اللہ سے ملنا ہے، ہر چیز کا جواب دینا ہے، کھانے میں حلال چیزوں کا اہتمام کرے گا، مکان بنائے گا، تو سوچے گا کہ ضرورت کے لیے بنا رہا ہوں، اس میں ہمیشہ نہیں رہنا ہے، اس سے پہلے معلوم نہیں یہاں کون تھا، اس کے بعد معلوم نہیں کون رہے گا، میں بھی کبھی اپنے دفتر میں بیٹھ کر سوچتا ہوں کہ معلوم نہیں میرے بعد یہاں کون بیٹھے گا، دنیا میں تو یہی نقشہ ہے۔

دنیا مسافر خانہ ہے- ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کا واقعہ

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ جو اپنے زمانے میں ایک بڑے بادشاہ تھے، ایک بار ان کا دربار لگا ہوا تھا، سارے ارکانِ دولت و وزیر لوگ موجود ہیں اور بہت سارے دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، اسی دوران ایک آدمی ان کے محل کے اندر آیا اور دربار میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کو دربانوں نے روکنا چاہا، تو اس نے کہا کہ میں یہاں اپنا سامان رکھ کر کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دربانوں نے اس سے کہا کہ تو بے وقوف ہے، پاگل ہے؟ تجھے معلوم نہیں کہ یہ بادشاہ کا دربار ہے، محل

ہے؟ اس نے کہا کہ دربار ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ تو سرائے ہے، مسافر خانہ ہے، اس لیے میں کچھ دیر یہاں رُکنا اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حجت و بحث ہو رہی تھی کہ بادشاہ کی نظر اس پر پڑ گئی، ابراہیم بن ادھم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے حکم دیا کہ کیا بحث ہو رہی ہے؟ اس کو بلا کر لاؤ۔ اب اس آدمی کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ آدمی محل میں آرام کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سرائے و مسافر خانہ ہے۔ بادشاہ نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ تو اس آدمی نے کہا کہ یہ سرائے ہے، اس میں میرا بھی حق ہے، جیسا کہ آپ کا حق ہے، آپ یہاں رہ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں رہ سکتا؟ میں مسافر ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ نے کہا کہ یہ سرائے نہیں ہے، مسافر خانہ نہیں ہے، میرا محل ہے۔ اس آدمی نے بادشاہ سے پوچھا کہ آپ سے پہلے یہاں کون تھا؟ بادشاہ نے کہا کہ میرا باپ تھا، اس آدمی نے پھر پوچھا کہ ان سے پہلے کون تھا؟ بادشاہ نے کہا کہ میرا دادا تھا، اس نے پوچھا کہ اس سے پہلے کون تھا؟ بادشاہ نے کہا کہ میرا پر دادا تھا، یہ تو پیڑی در پیڑی ہمارے خاندان میں حکومت چلی آ رہی ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ میں یہی تو کہنا چاہتا ہوں کہ کبھی تو یہاں آپ کا پردادا تھا، کبھی آپ کا دادا تھا، کبھی آپ کا باپ تھا، اب آپ ہیں، کل آپ بھی نہیں رہیں گے، کوئی اور اس جگہ آ جائے گا، کوئی آتا ہے، تو کوئی جاتا ہے، اسی کا نام تو سرائے ہے، مسافر خانہ ہے۔ یہ کہہ کر وہ آدمی غائب ہو گیا، یہ دراصل اللہ کا فرشتہ تھا، جو بادشاہ کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اب بادشاہ پریشان ہو گیا، اس کی باتوں پر غور کرنے لگا کہ واقعی یہ دنیا ہے، مجھ سے بھی چھوٹ جائے گی، جیسے میرے باپ سے چھوٹ گئی، جیسے میرے دادا سے چھوٹ گئی، سب چھوڑ کر چلے گئے، کیسے کیسے بادشاہ آئے، مگر سب چھوڑ کر چلے گئے، ایسے ہی ایک دن میں بھی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ اب جو رات ہوئی، تو یہ باتیں سوچ سوچ

کر بادشاہ کو نیند نہیں آئی، بالآخر یہ فیصلہ کرلیا کہ اس سے پہلے کہ دنیا مجھے چھوڑ دے، مجھے دنیا کو چھوڑ دینا چاہیے، انہوں نے حکومت چھوڑ دی اور حضرت فضیل بن عیاض رَحِمَہُ اللہُ کی خدمت میں چلے گئے۔

تارک الدنیا بن جاو

بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک ہے ''تارک الدنیا'' ہونا، ایک ہے ''متروک الدنیا'' ہونا، تارک الدنیا ہونا کمال ہے، متروک الدنیا ہونا کوئی کمال نہیں۔ متروک الدنیا کا مطلب یہ ہے کہ دنیا خود ہم کو چھوڑ دے، تارک الدنیا یہ ہے کہ ہم دنیا کو لات ماردیں، اگر دنیا ہی ہم سے روٹھ گئی، چھوٹ گئی، جیسے موت آ گئی، تو دنیا خود ہم سے چھوٹ جائے گی، ہم لاکھ چاہیں بھی تو دنیا ہمارے پاس نہیں رہے گی۔ یہ متروک الدنیا ہونا ہے، متروک الدنیا ہونے سے پہلے تارک الدنیا بن جاو یعنی دنیا کو خود لات ماردو، جیسا کہ ابراہیم بن ادھم رَحِمَہُ اللہُ نے دنیا کو لات ماردی اور یہی کمال ہے؛ اس لیے کہ ایک دن تو متروک الدنیا ہر آدمی ہو جائے گا، جب موت آئے گی تو کیا دنیا ہم سے دور نہیں ہو جائے گی؟ دنیا لات مار کر کہے گی چل یہاں سے، یہاں تو رہنے کا بھی تجھے حق نہیں ہے، گڑ جا زمین میں، مِٹ جا، اب میں تیری نہیں ہوں، اب میں تیری بیوی کی ہوں، تیرے بچوں کی ہوں، تیرے خاندان کی ہوں۔ اب یہ آدمی کہے کہ میں نے تجھے کتنی محنت سے کمایا تھا، تیرے لیے کیسی کیسی قربانیاں دی تھیں، میں نے تیرے لیے خون پسینا ایک کیا تھا، تو دنیا کہے گی کہ میرا سب کے ساتھ یہی برتاو ہے، میں سب کو اسی طرح لات مارتی ہوں، ہاں کوئی اللہ کا بندہ مجھے لات ماردے، تو میں اس کے قدموں میں گر جاتی ہوں اور جو مجھے سر پے بٹھاتے ہیں میں انہیں لات مارتی ہوں، یہ دنیا کا قانون ہے، اس لیے تارک الدنیا بن جاؤ۔

اللہ سے ملاقات کے آداب

فرمایا کہ ایک آدمی اپنے ایک محبوب سے یا کسی محترم، معظم شخصیت سے ملاقات کا ارادہ کرے، تو کیا وہ اس بات کا اہتمام نہیں کرے گا کہ اس کا انداز، اس کی حالت، اس کا طور، طریقہ سب کچھ ایسا ہو، جو محبوب کو پسند آجائے؟ وہ ضرور اس بات کی کوشش کرے گا کہ میرا ظاہر اور باطن، میرا لباس و پوشاک، میری ہر ادا ایسی ہو، جو اُن کو پسند آجائے۔ اس لیے وہ نہائے گا، دھوئے گا، اپنے آپ کو معطر کرے گا، سنوارے گا، بنائے گا، زیب وزینت کی سب چیزیں اختیار کرے گا؛ ورنہ اگر یوں ہی بے ڈھنگے طریقے پر ملنے چلا گیا، تو ایسا آدمی محبوب کی ملاقات کے قابل نہیں کہلائے گا۔

اسی طریقے پر اللہ سے ملاقات کا جب مؤمن کو یقین ہو، تو اس کی ہر ادا میں اس بات کا لحاظ ہونا چاہیے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ میرے خدا کو پسند آجائے، چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، بولنا، اسی طرح میرا لباس و پوشاک، طور وطریقہ، میری نماز، میرا حج، میری زکوۃ، میرا روزہ اور جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں وہ اللہ کو پسند آجائے، ایسا نہ ہو کہ اللہ ناراض ہو جائے۔ جب دنیا میں آدمی اپنے فانی اور ادنی قسم کے محبوب سے ملاقات کے لیے اپنے آپ کو اتنا بناتا اور سنوارتا ہے، تو یہ کیسا بندہ ہے، جو اپنے محبوبِ حقیقی اور ہمیشہ باقی رہنے والے خدا سے ملاقات کے لیے کچھ بھی تیاری نہیں کرنا چاہتا؛ اپنے ظاہر و باطن کو بنانے اور سنوارنے کی فکر نہیں کرتا، یہ کیسا ملاقات کا متمنی ہے، جو رات رات بھر سوسو کے گذارتا ہے؟ لہٰذا یہ کوشش کریں کہ میرا چہرہ اللہ کو پسند آنے والا ہو، میرا لباس اللہ کو پسند آنے والا ہو، میری ادائیں اللہ کو پسند آنے والی ہوں۔

اللہ کی پسند کیا ہے؟

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیا خبر کہ اللہ کو کیا پسند ہے؟ اللہ کو کونسا لباس

پسند، کونسا چہرہ پسند، کونسا طور وطریقہ پسند، جب ملاقات ہوگی تب پوچھ لیں گے، ہمیں کیا معلوم؟ اگر کوئی بے وقوف یہ سوال کرے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسی لیے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے بھیجا ہے کہ میرے بندوں کو آپ بتا دیجیے کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند، میں کیسے کو پسند کرتا ہوں، کیسے کو پسند نہیں کرتا، لباس میں مجھے کیا پسند، وضع قطع میں کیسی پسند کرتا ہوں، چہرہ کیسا پسند کرتا ہوں، اسی طرح دیکھنے میں مجھے کیا پسند اور کیا ناپسند، سننے میں مجھے کیا پسند، کیا ناپسند، بولنے میں مجھے کیا پسند اور کیا ناپسند، چلنے، اٹھنے، بیٹھنے میں مجھے کیا پسند اور کیا ناپسند، اسی طرح نماز میں کیسی پسند کرتا ہوں، روزہ میں کیسا پسند کرتا ہوں، حج میں کیسا پسند کرتا ہوں، یہی بتانے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا گیا۔

معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرنا مؤمن کے لیے ضروری ہے، اسی لیے قبر میں یہ سوال بھی کیا جائے گا کہ "من هذا الرجل الذي بعث فيكم؟" (یہ کون آدمی ہیں، جن کو تم میں مبعوث کیا گیا؟) دنیا میں جب آپ کو جانیں گے نہیں، تو وہاں کیا بتا سکتے ہیں اور اللہ کی پسندیدہ چیزوں کا ہمیں علم کیسے ہوگا؟

ایک بزرگ کو اللہ سے ملاقات کی خوشی

فرمایا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ اس طرح دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کر کے اللہ تعالیٰ کی مرضیات ونامرضیات کو جان کر اس کے مطابق زندگی گذارتا ہے؛ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا کرتا ہے اور سفرِ آخرت کا انتظار کرتا ہے اور ہنستے ہنستے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

ہمارے بزرگوں کے بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں: ایک واقعہ یاد آ گیا کہ

بھوپال میں ایک بزرگ حضرت مولانا یعقوب صاحب مجددی رَحِمَہُ اللہُ گذرے ہیں، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب رَحِمَہُ اللہُ ان کی مجلس میں جا کر بیٹھا کرتے تھے اور ان کے ملفوظات بھی جمع فرمائے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال کا وقت آیا، تو جمعہ کا دن تھا، صبح کے وقت اٹھ کر جلدی سے انھوں نے غسل کیا اور عمدہ کپڑے پہنے، بڑے حشاش بشاش نظر آرہے تھے اور چہرے پر مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تھی، لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ کا کوئی سفر ہے کیا، بہت جلد تیار ہو گئے ہیں؟ کہا کہ ہاں! سفر ہے، لوگ سمجھے کہ کہیں قریب کا سفر ہوگا؛ لیکن حضرت گئے ہی نہیں، نمازِ جمعہ کا وقت قریب آنے لگا، تو خادموں سے کہا کہ تکیہ لاؤ! تکیہ لایا گیا؛ پھر حضرت لیٹ گئے اور کلمہ پڑھا اور روح قبض ہوگئی؛ تب لوگوں کو سمجھ میں آیا کہ یہ پوری تیاری دراصل آخرت کے سفر کے لیے تھی، دیکھیے اللہ سے ملاقات کی ان کو کیسی خوشی تھی؟۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو موت کی تمنا

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ ایک دفعہ آپ بیٹھے ہوئے تھے، ایک صاحب سامنے سے دوڑتے ہوئے جا رہے تھے، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹھیرا کر پوچھا کہ بھاگ بھاگ کر کہاں جا رہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ حضرت بازار جا رہا ہوں، تو حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ارے بھائی! بازار میں کہیں موت بکتی ہو، تو ایک عدد میرے لیے خرید کر لانا۔ اللہ اکبر!!! دیکھیے! موت کا کس قدر انتظار لگا ہوا ہے۔

ارے! جس ذات سے ملاقات کے لیے اتنی تیاری کیا ہو، کیا وہ اس سے ملاقات کی خواہش نہیں کرے گا؟ ایک مثال دیتا ہوں کہ کوئی محترم و معظم مہمان آپ

کے گھر میں آنے والا تھا، آپ نے اس کے لیے بہترین کھانے پکائے، اپنے گھر کو سجایا، اس کے لیے بیٹھک بنائی، راحت کا انتظام کیا، سب کچھ کیا، یہ سب کچھ کرنے کے بعد کیا آپ کو ہر لمحہ ان کے آنے کا انتظار نہیں ہوگا؟ ضرور ہوگا، اگر عین اس موقعہ پر کوئی آکر خبر دے کہ وہ نہیں آئیں گے، تو آپ کے دل پر اس وقت کیا گذرے گی؟

اسی طریقے پر جب مؤمن بندہ اپنے آپ کو اللہ کے لیے تیار کرلے گا اور اللہ سے ملاقات کے قابل اپنے آپ کو بنالے گا، تو وہ انتظار کرے گا کہ کب آئے گا فرشتہ لے جانے، کب روح قبض ہوگی اور میں کب اللہ سے ملاقات کروں گا۔

کیا موت کی تمنا کرنا جائز ہے؟

یہاں ایک مسئلہ بھی سمجھ لیجیے کہ دنیا کے مسائل سے تنگ آکر موت کی تمنا کرنا حرام ہے اور اللہ سے ملاقات کے لیے تمنا کرنا عین مطلوب ہے اور یہ اولیا اللہ کی صفت ہے، اسی لیے یہودیوں نے جب یہ کہا: ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ [المائدۃ:۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے اور رشتہ دار ہیں) تو اللہ نے جواب میں فرمایا کہ اگر واقعی اللہ کے دوست ہو تو: ﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [الجمعۃ:۶] (اگر تم سچے ہو، تو موت کی تمنا کرکے دکھاو)

اس لیے کہ بیٹا باپ سے ملنے کی تمنا کرتا ہے، رشتہ دار رشتہ دار سے ملنے کی خواہش کرتا ہے، اگر تم اللہ کے بیٹے ہو، اللہ کے رشتہ دار ہو، تو موت کی تمنا کرکے دکھاؤ گے، اللہ نے خود ہی چیلنج کردیا کہ ﴿ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا ﴾ [الجمعہ:۷] (کہ یہ قیامت کی صبح تک موت کی تمنا نہیں کرسکتے)

چنانچہ دنیا میں آج تک پوری تاریخ میں کوئی یہودی پیدا نہیں ہوا، جو قرآن کے اس چیلنج کو چیلنج کردے، کسی نے موت کی تمنا نہیں کی، اس لیے کہ وہ اللہ کے نہ بیٹے

تھے، نہ رشتہ دار تھے، نہ اللہ کے دوست ولاڈ لے؛ لیکن اسلام کی تاریخ پڑھیے، شروع سے آخر تک ہزاروں اولیا اللہ ملیں گے، جنھوں نے موت کی تمنا کی ہے۔

قبر میں ساتھ کون آئے گا؟

قبر میں کون ساتھ آئے گا ؟ نہ باپ آئے گا، نہ بیٹا آئے گا، سارے لوگ قبر پر آ کر دفن کر کے چلے جائیں گے، دنیا میں بہت چاہنے والے تھے، بہت دوست تھے؛ لیکن وہاں اپنی دوستی کا اظہار کرتے ہوئے کوئی نہیں کہے گا کہ میرا دوست مر کے قبر میں جا رہا ہے، میں بھی اس کے ساتھ جا کر سو جاؤں گا، بیوی شوہر کے ساتھ نہیں جائے گی، شوہر بیوی کے ساتھ نہیں جائے گا، ماں بہت محبت کرتی تھی؛ لیکن مرنے کے بعد بچے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی ہے، ڈر کے بھاگ جاتی ہے، اس طرح ماں باپ تک دور ہوجاتے ہیں، کوئی قبر میں ساتھ نہیں آتا، جیسے ائیر پورٹ (AIRPORT) پر بھی ہوتا ہے کہ پہنچانے والے آتے ہیں، تو بس وہیں سے رخصت ہوجاتے ہیں، اندر کون جائے گا؟ کوئی نہیں، سب باہر باہر سے رخصت ہوجاتے ہیں، اب اکیلے ہی چلے جانا ہے، اندر جو بھی حالات پیش آجائیں، اس کو سنبھال لینا ہے اور رخصت ہونے والا بزبانِ حال یہ شعر پڑھتا ہے ؎

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو ! شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

اللہ اکبر! کیا عجیب شعر ہے؟ قبر میں جانے والا بول رہا ہے، پہنچانے والوں کو، جو اٹھا کر لائے ہیں، دفن کر چکے ہیں، اب ان سے کہتا ہے کہ اب آگے کسی کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کسی کو الاؤ (Allow) نہیں ہے، ہم اکیلے چلے جائیں گے۔

قبر کی آواز

اس لیے قبر میں جانے کے لیے اپنے آپ کو خود ہی تیار کرنا ہے، کہ تنہا مجھے جانا ہے، اس کے لیے ساری تیاریاں ابھی سے کرنی ہیں۔

ایک حدیث یاد آگئی کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے تشریف لائے، تو بعض صحابہ کو دیکھا کہ وہ ہنسی مذاق کر رہے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اگر تم کثرت کے ساتھ " **هازم اللذات**" یعنی لذتوں کو ختم کر دینے والی چیز "موت" کو یاد کرو، تو وہ تم کو اس حرکت سے باز رکھے گی۔ پھر فرمایا کہ قبر روزانہ یہ کہتی ہے کہ میں اجنبیت کا مکان ہوں، میں تنہائی کا مقام ہوں، میں مٹی کا مکان ہوں، میں کیڑوں کا مکان ہوں۔

(ترمذي: ۲۴۶۹)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک ہوئے، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ قبر کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا کہ قبر روزانہ چیخ چیخ کر کہتی ہے کہ اے ابنِ آدم! تو نے مجھے کیسے بھلا دیا، کیا تو نہیں جانتا کہ میں تنہائی کا مکان ہوں، اجنبیت کا مکان ہوں، وحشت کا مکان ہوں، کیڑوں کا مکان ہوں اور تنگی کا مکان ہوں؟

(معجم أوسط طبراني: ۸/۲۷۲)

بزرگو اور بھائیو! اس تنہائی اور وحشت و دہشت کے گھر میں اور کیڑوں، مکوڑوں، سانپوں، بچھوؤں کے گھر میں ایک نہ ایک دن ہمیں جانا ہے اور وہیں سونا ہے، معلوم نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا کیا پیش آئے گا؟

نظیر آبادی ایک شاعر گزرے ہیں، انھوں نے ایک نقشہ کھینچا ہے ؎

کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا ☆ مشین بدن تھا، مبیض کفن تھا
جو قبرِ کُہن ان کی اکھڑی، تو دیکھا ☆ نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

کیا عجیب اور جاندار شعر ہے؟ اللہ اکبر!! اس لیے کچھ نہ کچھ موت کی فکر کرو، آخرت کی تیاری کرو، یہی آخرت کی تیاری ہمارے لیے اصل ہے۔

تین بھائیوں کا قصہ

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ ایک آدمی کے تین بھائی تھے، ایک بڑا بھائی، ایک درمیانی اور ایک اس سے چھوٹا۔ جب اس شخص کا انتقال ہونے لگا، تو اس نے اپنے بڑے بھائی کو بلایا اور کہا کہ آپ میرے بڑے بھائی ہیں اور میری موت کا وقت آ گیا ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ ساتھ رہیں، میری قبر میں بھی آپ تشریف لائیں اور مجھ سے کبھی جدا نہ ہوں۔ وہ بڑا بھائی کہہ دے گا کہ میں تو یہ کام نہیں کر سکتا؛ البتہ اتنا کر سکتا ہوں کہ جب تک تیری جان میں جان ہے، تیرے پاس بیٹھا رہوں گا؛ لیکن جوں ہی تیری جان نکل جائے گی، پھر میرا اور تیرا کوئی رشتہ نہیں۔

وہ مرنے والا مایوس ہو کر اپنے دوسرے بھائی کو بلائے گا اور کہے گا کہ بھائی دیکھو! آپ بھی میرے بھائی ہیں، آپ کا ہمارا دوستانہ رہا، ہم میں پیار محبت رہی اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرتے رہے، اب میری موت کا وقت آ گیا ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ میری قبر میں بھی آ جائیں تا کہ وہاں بھی ساتھ ساتھ رہیں جیسے یہاں ساتھ ساتھ رہے۔ وہ کہے گا کہ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ میں تیرے ساتھ آ جاؤں، ہاں! اتنا کر سکتا ہوں کہ جب تک تیری جان میں جان ہے، تیرے پاس رہوں گا، جان نکل جائے، تو تجھے نہلاؤں گا، دُھلاؤں گا اور پھر اس کے

بعد تجھ کو اٹھا کر لے جاؤں گا، قبر میں تجھ کو پہنچا کر اس کے بعد واپس آ جاؤں گا۔

وہ مایوس ہو کر تیسرے چھوٹے بھائی کو بلا کر کہے گا کہ میں نے تجھے مارا ہے، پیٹا ہے، تجھ پر چھوٹا ہونے کی وجہ سے ظلم بھی کیا ہے؛ لیکن اب میرا بڑا خراب وقت آ گیا ہے، میں مرنے جا رہا ہوں، میرا کوئی سہارا نہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ ساتھ رہے اور تو میری قبر میں بھی میرے ساتھ آ جائے۔ تو یہ تیسرا بھائی کہے گا کہ ہاں! جب تک کہ روح تیری موجود ہے، دم میں دم موجود ہے، تب تک بھی میں تیرے ساتھ ہوں اور جب تو مر جائے گا تو نہلانے دھلانے میں، سب میں شریک رہوں گا اور جب قبر میں تجھے دفن کیا جائے گا، تو وہاں بھی تیرے ساتھ ساتھ آ جاؤں گا۔

حضرت نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ سنا کر صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کیا تم کو سمجھ میں آیا کہ یہ تین بھائی کون تھے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: "**اللّٰه ورسولهٗ أعلم**" (اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں) آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ آدمی کا پہلا بھائی اس سے مال و دولت مراد ہے، جب آدمی اس سے کہے گا کہ میرے ساتھ قبر میں چل، تو مال و دولت یہ کہے گی کہ نہیں، نہیں!! میں تو تیرے ساتھ نہیں آ سکتی، ہاں جب تک تیری جان میں جان ہے، میں تیری ہوں اور جب جان نکل گئی تو تیرا، ہمارا کوئی رشتہ نہیں، روح نکلتے ہی مال تو کسی اور کا ہو جاتا ہے، دوسرے لوگ ہڑپ کرنے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں؛ بل کہ ایسے واقعات بھی آج کل پیش آ رہے ہیں کہ اِدھر روح قبض ہوئی اور اُدھر مال کے بارے میں جھگڑا شروع ہو گیا کہ مجھے ملے، تجھے ملے، تو یہ بڑا بھائی مال ہے۔ اور فرمایا کہ دوسرے بھائی سے مراد دراصل رشتہ دار ہیں، دوست احباب ہیں، یہ آدمی کے ساتھ اس وقت تک رہتے ہیں، جب تک کہ قبر میں اس کو دفن کیا جاتا ہے؛ لیکن قبر میں دفن ہوتے ہی سب کے سب واپس

آجاتے ہیں۔اور تیسرا چھوٹا بھائی کون ہے؟ فرمایا کہ تیسرے بھائی سے مراد اس کے اچھے یا بُرے اعمال ہیں۔ (كتاب الأمثال للمحدث رامهرمزي)

ایک حدیث میں اسی مضمون کو اس طرح مختصر کر کے بیان فرمایا کہ میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، دو واپس لوٹ جاتی ہیں اور ایک اسی کے ساتھ باقی رہ جاتی ہے،اس کے اہل وعیال،اس کا مال اور اس کا عمل تین جاتے ہیں،اہل وعیال اور مال واپس چلے آتے ہیں اور عمل اس کے ساتھ رہ جاتا ہے۔

(ترمذي: ۲۳۷۹)

الغرض! قبر میں صرف اعمال ہی ہمارے ساتھ جائیں گے اور کوئی چیز ساتھ نہیں جائے گی،اس لیے قبر کے حالات ہمیشہ ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔

موت کا مراقبہ ہونا چاہیے!

اس لیے روزانہ تھوڑی دیر کے لیے موت کا مراقبہ کیا جائے، مراقبہ کس طرح کریں؟ علمانے لکھا ہے کہ مراقبہ اس طرح کرو کہ دس منٹ یا پندرہ منٹ کے لیے بیٹھ جاؤ سکون کے ساتھ اور خیال کرو کہ میں مرگیا ہوں، میری روح نکل چکی ہے، اور مجھے لِٹایا گیا ہے، سارے رشتہ دار میرے اِرد گرد جمع ہو گئے ہیں، رونے والے رو رہے ہیں، ہنسنے والے ہنس رہے ہیں، میری موت پر خوشی منانے والے خوشی منا رہے ہیں، بہت سوں کو دُکھ و دَرد ہو رہا ہے، تو وہ چیخ، پکار کر رہے ہیں اور پھر مجھے نہلانے کو لے جایا جارہا ہے، میرے کپڑے اتارے جارہے ہیں، کفن پہنایا جارہا ہے، جنازے کی نماز پڑھی جاری ہے، میرا جنازہ اٹھا کر لوگ مجھے قبرستان لے جارہے ہیں، پھر مجھے تنِ تنہا اندھیری قبر میں اُتار کر واپس چلے جارہے ہیں، پھر قبر میں سوال ہو رہا ہے، پھر اللہ کے حضور میں پیشی ہو رہی ہے، حساب و کتاب ہو رہا ہے وغیرہ

وغیرہ۔ یہ سب ہوتا ہے کہ نہیں ہوتا؟ جی ہاں! یہ سب کچھ ہوتا ہے، اس کا مراقبہ کرتے رہنا چاہیے۔

فرمایا کہ ان چیزوں کا مراقبہ آدمی روزانہ کرے، یا کم از کم دو چار دن کے بعد کرتا رہے؛ مگر بہت سارے لوگ موت کا مراقبہ کرنے سے ڈرتے ہیں، موت کے مراقبے سے کیا ڈر ہے؟ اس سے موت کی فکر، موت کی یاد پیدا ہو جائے گی اور آدمی اپنے آپ کو سنبھالنے، بنانے اور سُدھارنے میں آسانی محسوس کرے گا اور انشاء اللہ آدمی کے اندر ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا اور وہ اپنی آخرت کی فکر و تیاری کرنے لگے گا۔

عقل مند کی پہچان

اور یہی دراصل آدمی کے عقل مند ہونے کی نشانی و پہچان ہے، لوگ عقل مند اُس کو سمجھتے ہیں، جو دنیا کی فکر میں لگا رہے اور خوب کمائے اور خوب کھائے، حلال و حرام کی کوئی تمیز کیے بغیر مال و دولت جمع کرے؛ لیکن آیئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اسلام نے عقل مند کس کو کہا ہے؟

حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے، سلام پیش کیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! أيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ أَفْضَلُ؟ (مؤمنین میں سب سے افضل کون ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ” أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً “(جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو) انھوں نے پوچھا کہ ” أَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ أَكْيَسُ؟“ (کون مسلمان سب سے زیادہ عقل مند ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:” أَكْثَرُهُمْ لِلْمَوْتِ ذِكْراً وَ أَحْسَنُهُمْ

لِمَا بَعْدَهُمْ اِسْتِعْدَاداً ، أُولٰئِکَ الْأَکْیَاسُ "(ان میں سے جولوگ سب سے زیادہ موت کو یاد کرتے ہیں اور بعد کی زندگی کے لیے سب سے اچھی تیاری کرنے والے ہیں، یہی لوگ عقل مند ہیں۔

(ابن ماجه: ۴۲۵۹، مستدرک : ۴/۵۸۲، تذكرة للإمام قرطبي: ۱/۸)

معلوم ہوا کہ اصل میں عقل مند وہی ہے، جو موت کو یاد کرتا ہو اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے تیاری کرتا ہو۔

دنیا جمع کرنے والا بے عقل ہے

اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ صرف دنیا کے پیچھے پڑنے والا اور اسی کی دُھن و خیال میں رہنے والا اور اس کو جمع کر کر کے دنیا ہی کے لیے رکھنے والا بے وقوف و بے عقل ہے؛ اگر چہ کہ لوگ اس کو بڑا عقل مند سمجھتے ہیں؛ چناں چہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :" اَلدُّنیَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهُ وَ مَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهُ وَ يَجْمَعُ لَهُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ "(دنیا اس کا گھر ہے، جس کا کوئی اور گھر نہ ہو اور اس کا مال ہے جس کا کوئی اور مال نہ ہو اور اس کے لیے وہی جمع کرتا ہے، جس کو عقل نہ ہو)۔ (مشكاة المصابيح: ۵۲۱۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص صرف دنیا کی خاطر دنیا کو جمع کرتا ہے، وہ بے عقل ہے، بے وقوف ہے؛ کیوں کہ جب اس کو یہیں چھوڑ کر جانا ہے، تو اس کی خاطر کیوں جمع کرتا ہے؟ ہاں! کوئی دنیا کو آخرت کے لیے جمع کرتا ہے، تو یہ عقل مند ہے۔ مثلاً: دنیا کو جمع کرتا ہے، تا کہ اللہ کے راستے میں خرچ کروں گا، مسکین و بیواؤں کو، بے کس و محتاج لوگوں کی امداد کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کروں گا؛ تو یہ شخص بڑا

عقل مند ہے کہ دنیا کو آخرت کا وسیلہ بنالیا ہے۔

حسابِ یسیر کی تفسیر

معلوم نہیں کہ وہاں ہمارا حساب کیسے ہوگا، آسان یا مشکل؟ کیا اس کٹھن مرحلے کو سوچ کر اس کی فکر نہیں ہونا چاہیے؟ اور کیا یہ خبر بھی ہے کہ آسان حساب کیا ہے اور مشکل کیا؟ قرآن کریم میں ایک آیت ہے، جس میں آسان حساب کا ذکر ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا﴾ [الإنشقاق:٨] (وہ شخص، جس کے نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں، تو اس کا آسان حساب لیا جائے گا)

اس آیت کے متعلق ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آسان حساب کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بعض لوگوں کا حساب آسان ہوگا، بعض لوگوں کا حساب مشکل ہوگا؟ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" **لَيْسَ أَحَدٌ يُحَاسَبُ إِلَّا هَلَكَ** "(جس سے بھی سوال کیا جائے گا، اس کی ہلاکت ہے)

(بخاري: ٤٦٥٥)

یعنی یہاں حسابِ یسیر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سوال ہی نہ کرے اور جنت کو بھیج دے؛ یہ حسابِ یسیر ہے اور اگر اللہ تعالیٰ پوچھ لے کہ تم نے یہ کیوں کیا، یہ کیوں نہیں کیا، تو بس پوچھ لینا ہی دراصل پکڑ لینا ہے، سوال کر لینا ہی اس کی ہلاکت ہے، اس لیے کہ اللہ سوال کرے اور بندہ اس کا جواب دے دے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

ارے بھائی! دنیا میں جب ہم کسی بادشاہ کو جواب نہیں دے سکتے، کسی پڑھے لکھے عقل مند کے پاس آپ پہنچ جائیں اور وہ سوالات کرنے لگے، کوئی بڑا جج

(JUDGE) سوال کرنے لگے، تو اس کے سوالات کا جواب ہم نہ دے پائیں، تو پھر اللہ کو کون جواب دے سکتا ہے، جو احکم الحاکمین ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے ؟ کسی سے اللہ تعالیٰ پوچھ لیں، تو سمجھ لو کہ جائے گا جہنم میں اور بغیر پوچھے چھوڑ دیں، تو سمجھ جاؤ کہ یہ بچ گیا۔

موت کو یاد کرنے کا فائدہ وفضیلت

الغرض! موت کی یاد اور آخرت، جس کے لیے ہم بنائے گئے ہیں، اس کی تیاری ضروری ہے اور آخرت کی فکر موت کی یاد سے پیدا ہوگی، اسی لیے موت کو یاد کرنے کی فضیلت بھی آئی ہے اور اس کا فائدہ بھی بتایا گیا ہے۔

امام قرطبی رَحِمَہُ اللہُ نے اپنی کتاب "تذکرۃ" میں یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ "كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظاً" (نصیحت کے لیے موت ہی کافی ہے) اور ایک حدیث میں فرمایا کہ :" أَكْثِرُوْا ذِكْرَ الْمَوْتِ فَإِنَّهٗ يُمَحِّصُ الذُّنُوْبَ وَ يُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا"(موت کو کثرت کے ساتھ یاد کرو؛ کیوں کہ وہ گناہوں کو پاک کرتی اور دنیا سے بے نیاز کرتی ہے۔)

(تذکرۃ للقرطبی: ۱/۸)

اس سے موت کو یاد کرنے کا بڑا عظیم فائدہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کی یاد آدمی کو گناہوں سے بچاتی ہے، آدمی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ جب مجھے مرنا ہے، تو خدا کے حضور بھی پیش ہونا ہے اور گناہ کروں گا، تو اس کا جواب بھی دینا پڑے گا، میں کیا جواب دوں گا ؟ یہ سوچ کر وہ گناہ چھوڑ دیتا ہے اور گناہوں کا چھوڑنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے، اس طرح موت کی یاد آدمی کو گناہوں سے دور کرتی ہے، اسی لیے اس کو واعظ کہا گیا ہے کہ موت خود ایک بہترین واعظ ونصیحت کرنے والی ہے،

آدمی کو کوئی اور نصیحت کرنے والا نہ ہو، تو ایک عقل مند آدمی اسی کو یاد کر کر کے نصیحت پکڑ لے گا۔

اور اس میں دوسری بات یہ بتائی کہ موت کی یاد آدمی کو دنیا سے زاہد و بے نیاز بنا دیتی ہے؛ کیوں کہ وہ سوچتا ہے کہ اس دنیا کو ایک نہ ایک دن چھوڑنا ہے اور قبر میں جانا ہے اور آخرت کے مراحل سے گزرنا ہے، میں اس کو لے کر اور پال کر کیا کروں گا؟ لہٰذا وہ صرف ضرورت کی حد تک اس دنیا سے لیتا ہے اور اس کی حرص میں مبتلا نہیں ہوتا۔ یہ دو فائدے جو بہت واضح ہیں، اللہ کے نبی ﷺ نے موت کی یاد کے بتائے ہیں۔

اور اس کی فضیلت یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا شہیدوں کے ساتھ کوئی اُٹھایا جائے گا؟ یعنی قیامت میں ان کے ساتھ کسی کو محشور کیا جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! جو آدمی رات دن میں بیس مرتبہ موت کو یاد کرے گا، اس کو ان کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔

(تذکرۃ: ۱/۸)

میرے بھائیو! کس قدر بڑی فضیلت ہے، اس کی جو موت کو یاد کرتا ہے کہ اس کو شہیدوں کے ساتھ قیامت میں اُٹھایا جائے گا۔

موت کو یاد کرنے والا شہیدوں کے برابر کیوں؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شہید کا مقام بہت اونچا ہے؛ کیوں کہ وہ اللہ کے راستے میں اپنی جان لٹا دیتا ہے، تو موت کو روزانہ بیس مرتبہ یاد کرنے والے کو اس کے برابر کا درجہ کیوں دیا گیا؟ اس کا جواب میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ جس طرح شہید اللہ کے لیے اپنی جان دیتا ہے، اسی طرح موت کو یاد کرنے والا اللہ کے

لیے اپنے نفس اور نفسانی خواہشات کی قربانی دیتا ہے اور موت کی یاد اس کو گناہوں سے باز رکھتی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، یہ بھی بہت بڑا کام ہے کہ آدمی اپنے نفس کی اور نفسانی خواہشات و لذات کی قربانی پیش کرے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : " **اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ** "(مجاہد وہ ہے، جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔)

(ترمذي : ۱۶۲۱ ،مسند أحمد: ۲۴۰۱۱ ،صحيح ابن حبان: ۱۰/۴۸۴)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل مجاہد وہی ہے، جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے؛ لہٰذا ایک شخص اگر موت کو کثرت سے یاد کرنے کی وجہ سے اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ و جہاد کرنے میں لگا، تو یہ واقعی مجاہد ہے اور اللہ کے راستے میں اس نے اپنے نفس کی قربانی دی ہے، اس لیے اس کو قیامت کے دن شہیدوں میں اُٹھایا جائے گا۔

حکیم الامت رحمہ اللہ اور استحضارِ موت کا طریقہ

فرمایا کہ حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ بڑے بڑے علما اور مشائخ کے مرشد تھے، انھوں نے اپنے حجرے میں دو شعر لکھوا کر دیوار پر لگا رکھے تھے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی جو خانقاہ ہے، ان کا کمرہ قبر سے کم نہیں ہے، آج بھی موجود ہے، ایک طرف ان کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کا کمرہ ہے، دوسری طرف ایک اور کمرہ ہے، جس میں پہلے حافظ ضامن شہید رحمہ اللہ رہتے تھے؛ پھر اس کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ رہتے تھے، دونوں کمرے بازو بازو ہیں اور اتنے چھوٹے اور ایسے اندھیرے ہیں کہ وہاں پر جانے کے بعد قبر تو ضرور یاد آجاتی ہے۔

تو وہ دو شعر پیش کررہا ہوں، جو حکیم الامت رحمہ اللہ کے حجرے میں آویزاں

ہیں اور حضرت اس کو پڑھا کرتے تھے، اس سے ان کے استحضارِ موت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ حضرت مجذوبؔ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہ کے اشعار ہیں، حضرت خواجہ مجذوبؔ عزیز الحسن، حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہ کے جلیل القدر خلیفہ گزرے ہیں، بہت بڑے شاعر بھی تھے، ان کے اشعار ہیں۔

رہ کے دنیا میں بشر کو نہیں زیبا غفلت
موت کا دھیان بھی لازم ہے کہ ہر آن رہے

جو بشر آتا ہے دنیا میں یہ کہتی ہے قضا
میں بھی پیچھے چلی آتی ہوں، ذرا دھیان رہے

اب دعا کیجیے کہ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے اور آخرت کی فکر، آخرت کی طلب اور تیاری کا جذبہ اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے توفیقِ مزید عطا فرمائے؛ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حقیقتِ طہارت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقیقتِ طہارت

یعنی اسلام میں پاکی صفائی کی حقیقت

الحمدللّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین أما بعد: فقد قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم :ألطُّهُور شَطْرُ الإِيْمَانِ

(طہارت آدھا ایمان ہے)

(مسلم: ۲۲۳،مسند أحمد: ۲۲۹۵۳،دارمي: ۱/۱۷۴)

یہ حدیث بہت مشہور ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت سے بچوں کو یاد بھی ہوگی، اس حدیث میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ طہارت ایمان کا آدھا حصہ ہے،طہارت کے معنے ہیں پاکی وصفائی۔

حدیثِ مذکورہ پر ایک اشکال

اس حدیث پر بظاہر ایک سخت اشکال ہوتا ہے،وہ یہ کہ اس میں ایمان کے ایک جزو،طہارت کو ایمان کا شطر کہا گیا ہے اور عربی میں شطر کے دو معنی ہیں:ایک معنی کسی چیز کا آدھا اور ایک معنی کسی چیز کا ایک جزو،اگر اس کے معنی جزو کے لیے جائیں، تب تو کوئی اشکال نہیں؛ کیوں کہ طہارت ایمان کا ایک حصہ وجزو تو ہے ہی،اس میں کیا شبہ ہے؟لیکن اگر اس کے معنی نصف وآدھے کے لیے جائیں،تو اشکال ہوگا کہ ایمان کے تو بہت سے شعبے اور ابواب ہیں، اجزا و حصے ہیں اور خود حدیث کے مطابق ستر

(۷۰) سے اوپر اس کے شعبے ہیں، تو اس حدیث میں صرف طہارت کو نصف ایمان کیسے فرمادیا گیا؟ کیا نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج، اور دیگر تمام امورِ دین ایک طرف اور صرف طہارت ایک جانب اور ان سب کے برابر؟ یہ بات بظاہر عجیب بھی لگتی ہے اور قابل اشکال بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب ہم اسلام میں طہارت کی حقیقت کیا ہے اس کو سمجھ لیں گے، تو یہ اشکال ختم ہو جائے گا اور معلوم ہوگا کہ واقعی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ طہارت ایمان کا آدھا حصہ ہے، آج میں اسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔

اشکال کا جواب

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں طہارت سے مراد صرف ظاہری طہارت نہیں ہے؛ بل کہ ظاہری و باطنی تمام قسم کی طہارتیں اس سے مراد ہیں، اسی لیے اس کی تشریح میں علما نے کہا ہے کہ پاکی اور طہارت چار قسم کی ہوتی ہے۔ ہم لوگ عام طور پر ایک طہارت و پاکی کو جانتے ہیں، تین پاکیوں کو نہیں جانتے، حالاں کہ وہ ساری پاکیاں مراد ہیں؛ جب وہ ساری پاکیاں مل ملا کر ہمارے اندر پیدا ہوں جائیں گی، تو ہمارا آدھا ایمان مکمل ہو جائے گا اور اگر صرف ایک پاکی ہمارے اندر پیدا ہوئی، تو آدھا ایمان مکمل نہیں ہوگا۔ اس طرح اس کو آدھا ایمان قرار دینا ان سب قسموں کے پیشِ نظر ہے؛ اس لیے اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ چار پاکیاں کیا ہیں؟ اب میں اسی کی تفصیل عرض کروں گا۔

طہارت کی پہلی قسم

علما فرماتے ہیں کہ ایک پاکی ظاہری جسم کی یا ظاہری چیزوں کی ہے، جیسے کپڑے پاک ہوں، جگہ پاک ہو، گھر پاک ہو، ایسے ہی ہمارا جسم پاک ہو۔

اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ ہر جمعہ کو غسل کرو اور اگر اس سے جلدی کریں، تو بہت اچھا ہے؛ روزانہ ہی کریں تو اور اچھا ہے اور غسل میں بھی اچھی طرح پاکی حاصل کرنے کا حکم ہے؛ چناں چہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾[المائدة:] (اور اگر تم ناپاک ہو، تو اچھی طرح پاکی حاصل کرو) "فَاطَّهَّرُوْا" کا ترجمہ ہے "پوری پوری طرح پاکی حاصل کرو" اس لیے کہ عربی کا قاعدہ ہے کہ الفاظ بڑھتے ہیں، تو معنے بھی بڑھتے ہیں؛ لہٰذا "فَاطَّهَّرُوْا" میں لفظ "ط" اور "ہ" پر تشدید ہونے کی وجہ سے وہ دو دو لفظ شمار ہوں گے؛ لہٰذا ان دو لفظوں کی زیادتی کی وجہ سے یہ معنے پیدا ہو گئے کہ پوری پوری طرح پاکی حاصل کرو، اس میں پورے مبالغہ کے ساتھ دھونے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

ایسے ہی ہر چیز پاک صاف اور مجلیٰ، مصفیٰ ہونی چاہیے اور اسی لیے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اپنے جسم کے اندر جو زائد بال اُگ آتے ہیں، ہفتہ میں یا پندرہ دن میں یا کم از کم چالیس دن میں ایک مرتبہ ان کی صفائی کر دینا چاہیے، ناخنوں کی پاکی صفائی کا حکم ہے کہ ان کو برابر کاٹتے رہو، حتیٰ کہ براجم (یعنی انگلیوں کے جوڑوں) کی صفائی کا حکم ہے۔ بالوں کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کا بھی حکم ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ان کے بال بکھرے ہوئے، گرد آلود تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز (تیل اور کنگھا) نہیں ہے، جس سے وہ اپنے بالوں کو ٹھیک ٹھاک کر لیتے؟ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا، جن کے کپڑے میلے کچیلے تھے، تو فرمایا کہ کیا ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس سے وہ اپنے کپڑوں کو دھو لیتے؟۔

(أبو داؤد: ۴۰۶۲،نسائي: ۵۲۳۶،مسند أحمد: ۳/۳۵۷)

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑوں کی پاکی وصفائی بہت ضروری ہے اور قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ﴾ [المدثر: ۴] (اپنے کپڑوں کو پاک رکھا کرو)۔

دیکھیے! قرآن کتنی اہم ترین کتاب ہے، آسمانوں سے نازل ہوئی ہے؛ لیکن اس عظیم کتاب میں کپڑوں کو پاک رکھنے کا حکم بھی ہے، اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بڑائی بیان کرنے کا حکم دیا ہے؛ چناں چہ فرمایا: ﴿وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ﴾ [المدثر: ۳] (اپنے رب کی بڑائی بیان کرو)

معلوم ہوا کہ رب کی بڑائی بیان کرنے کے لیے کپڑوں کی پاکی وصفائی ضروری ہے، ورنہ پھر غور کیجیے کہ دونوں میں کیا تعلق؟ جب اللہ کے دربار میں حاضری ہو، تو خوب پاک صاف ہونا چاہیے؛ اسی لیے وضو میں مسواک کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ منھ میں بدبو نہ رہے، اگر منھ میں بدبو رکھ کر اللہ کا نام لے گا، تو کیا مزہ آئے گا؟

کتنا سستا سودا ہے

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مسواک کے سلسلے میں فرمایا کہ یہ: ”مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ“ ہے۔ (بخاري: ۱۸۳۱)

مسواک کے دو فائدے بتائے: ایک یہ کہ مسواک منھ کو پاک وصاف کرنے والی ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مسواک رب کو راضی کرنے والی ہے۔ دیکھئے! مسواک کی کتنی بڑی فضیلت ہے؛ اس لیے کہ رب کی رضا سے بڑھ کر اور کیا چیز ہوسکتی ہے؟ اگر صرف منھ میں مسواک پھرا کر خدا کی مرضی مل رہی ہو، تو آپ بتائیے کہ کتنا سستا سودا ہے اور پھر بھی آدمی غفلت کر رہا ہے۔

میں بار بار سنایا کرتا ہوں کہ کسی بزرگ نے اللہ سے کہا کہ اے اللہ! آپ کی قیمت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ دونوں عالم میری قیمت ہے۔ یہ سن کر ان کو وجد آ گیا اور کہنے لگے۔

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتہ ☆ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اے اللہ! آپ نے اپنی قیمت دونوں عالم کو قرار دیا ہے؛ لیکن یہ قیمت آپ کی بہت کم ہے، اس لیے اپنی قیمت اور بڑھا دیجیے، یہ تو بڑا سستا سودا ہے، اتنے سستے آپ نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح یہ مسواک بھی ایک چھوٹی سی چیز ہے؛ مگر اس سے آپ اللہ کی رضا حاصل کر سکتے ہیں، اتنی بڑی فضیلت ہونے کے باوجود بہت سارے لوگ مسواک کا اہتمام نہیں کرتے۔

بیڑی، سگریٹ سے بچو

بعض لوگ بیڑی، سگریٹ پینے کے عادی ہوتے ہیں، جس سے منھ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے، اسی بدبو کے ساتھ مسجد میں آتے ہیں، ایسے لوگ کبھی نماز میں بازو آ کے کھڑے ہو جاتے ہیں، تو ان کے منھ کی بدبو کی وجہ سے نماز پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے، کتنی غلط بات ہے؟ آج عصر کی نماز میں ایک صاحب میرے بازو نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے، میں سچ کہتا ہوں، میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ میں نماز توڑ کے بھاگ جاؤں، ان کے پاس ایسی بدبو آ رہی تھی کہ جس کی وجہ سے مجھے اُبکائی سی آنے لگی، جی چاہ رہا تھا کہ نماز توڑ کے بھاگ جاؤں۔

اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ: ”مَنْ أَكَلَ الْبصَلَ وَالثُّوْمَ وَالْكُرَّاث فَلاَ يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا فَإِنّ الْمَلاَئِكَةَ تَتَأَذّٰى مِمَّا

يَتَأَذّٰى مِنْهُ بَنُوْ آدَمَ". (الترغيب والترهيب : ١/٢٢٣)

(جو شخص پیاز، لہسن یا کراث (جو ایک قسم کی بد بو دار تر کاری ہوتی ہے) کھائے، وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے؛ کیوں کہ فرشتے ان چیزوں سے تکلیف محسوس کرتے ہیں، جن سے بنی آدم تکلیف محسوس کرتے ہیں)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیڑی، سگریٹ اور اس جیسی بد بو دار چیزوں کا استعمال کرنے کے بعد مسجد کو بغیر منہ کی صفائی کے آنا منع ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بات اذیت ناک ہے اور غیر انسانی کام ہے؛ نیز بیڑی سگریٹ ویسے بھی نقصان دہ ہے، اس لیے بھی ان سے بچنا چاہیے۔

شریعت انسان بنناسکھاتی ہے

ان ساری باتوں سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شریعت پیش کی ہے، اس شریعت کے اندر یہ بھی ہے کہ انسان بن کر رہنا ہے، جانور بن کر نہیں رہنا ہے، اس کی تمام تعلیمات ہمیں انسان بناتی ہیں، انسانیت کا سبق دیتی ہیں؛ لہٰذا یہ پاکی، صفائی کی جتنی تعلیمات ہیں، وہ سب انسانیت کی تعلیمات ہیں۔ آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ جنگل کا شیر دانتوں کی صفائی کرتا ہو، برش استعمال کرتا ہو، یا مسواک کرتا ہو، صابون لگاتا ہو، منھ دھوتا ہو، نہیں! کیوں؟ اس لیے کہ وہ جانور ہے، اگر انسان بھی ایسا ہی رہے، تو اس میں اور جانور میں کیا فرق رہے گا؟

الغرض! یہ سب ظاہری پاکی، صفائیاں ہیں اور یہ پاکی کا پہلا اور ایک درجہ ہے، اس کی بھی بڑی ضرورت ہے، بڑی اہمیت ہے اور اس کو تو ہم سب جانتے ہی ہیں۔

مسلمانوں کی پاکی، صفائی میں کوتاہی

مگر اس کو جاننے کے باوجود اس میں کوتاہی سب سے زیادہ مسلمان کرتے ہیں،

جن کے نبی کی شریعت میں پاکی وصفائی کی اس قدر اہمیت وضرورت بیان کی گئی ہے۔
آج اکثر عام مسلمان اور بعض دین دار لوگ بھی پاکی صفائی کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، جو باعثِ شرم بات ہے،اس کے مقابلے میں غیر مسلم لوگوں میں اس کا اہتمام نظر آتا ہے ،ان کے محلے ہمارے محلوں کے لحاظ سے صاف ستھرے رہتے ہیں، ان کے مکانات ہمارے مکانات کے مقابلے میں صاف وپاک نظر آتے ہیں، ان کے ہسپتال وادارے ہمارے اداروں اور ہسپتالوں کے لحاظ سے صاف و پاک دکھائی دیتے ہیں،ان کے کپڑے اور چیزیں ہمارے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرے معلوم ہوتے ہیں؛ حالاں کہ معاملہ اس کے خلاف ہونا چاہیے تھا کہ ہم صفائی وپاکی کا زیادہ اہتمام کرتے ؛مگر ایسا نہیں ہوتا؛ بل کہ بعض جاہلوں نے تو حد ہی کر رکھی ہے کہ وہ صفائی، ستھرائی کے نظام کو غیروں کا طریقہ سمجھتے ہیں اور اس کے اہتمام کو غلط و تکلف خیال کرتے ہیں، یہ دینِ اسلام سے انتہائی جہالت کی بات ہے۔

اسی قسم کے ایک شخص کا واقعہ سنا تھا کہ ایک نومسلم صاحب، جو پہلے انگریز تھے، اسلام میں آنے کے بعد نماز کے لیے مسجد آئے ،تو وہاں دیکھا کہ حوض کی نالی میں کسی نے پان کھا کر اس کی پیک اس طرح تھوکی ہے کہ اس کے اطراف واکناف میں پھیل گئی ہے،ان نومسلم نے یہ دیکھ کر کہا کہ اس کی صفائی کرنا چاہیے، یہ کسی نے غلط کام کیا ہے۔اس پر وہاں کے مؤذن نے کہا کہ یہ دیکھو! مسلمان تو ہو گیا ہے مگر ابھی تک اس میں سے انگریزیت نہیں گئی۔**لا حول ولا قوة إلا بالله** !!، گویا اس بے وقوف کے نزدیک اسلام ایک گندہ مذہب ہے اور انگریزوں کا مذہب صفائی و پاکی کا مذہب ہے۔

بہر حال! اسلام میں پاکی وصفائی کی پہلی قسم یہ ہے کہ جسم کی، گھر کی، کپڑوں

کی، مکان کی اور دیگر ظاہری چیزوں کی پاکی وصفائی کی جائے۔

طہارت کی دوسری قسم

اس کے بعد دوسرے نمبر کی پاکی، صفائی ہے؛ وہ کیا ہے؟ امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اپنے ظاہری اعضا کو ظاہری گناہوں سے صاف و پاک کر لینا''، یہ ہے دوسرے قسم کی طہارت۔

ظاہری اعضا کیا ہیں؟ جیسے آنکھ، کان، ناک، زبان، ہاتھ اور پیر وغیرہ، یہ سب ظاہری اعضا ہیں، ان ظاہری اعضا سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو؛ تب ہمارے یہ اعضا پاک ہیں، صاف ہیں اور اگر ان اعضا سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے، تو وہ اعضا گناہ گار ہو کر ناپاک ہو جاتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کو پاکی، صفائی سے اس کا تعلق ہی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا، ہم پاکی، صفائی اس کو سمجھتے ہیں کہ اسنو(SNOW) لگا لیا جائے، پوڈر(POWDER) لگایا جائے، عمدہ کپڑے پہن لیے جائیں، بس یہ ہے پاکی وصفائی، لوگ نہا دھو کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم پاک ہو گئے، صاف ہو گئے؛ لیکن زبان سے غلط باتیں بول رہے ہیں، جھوٹ بک رہے ہیں، گالی دے رہے ہیں اور آنکھیں غلط دیکھ رہی ہیں، حرام و ناجائز چیزوں سے انتفاع کر رہی ہیں اور کان غلط استعمال کیے جا رہے ہیں، ان سے غیبتیں اور چغلیاں اور جھوٹ سن رہے ہیں، تو ظاہر میں تو یہ آدمی پاک و صاف ہے اور اس کا ظاہر بہت اچھا ہے؛ مگر آنکھیں اس کی بڑی گندی ہیں، کان ناپاک ہیں، زبان ناپاک ہے، یہ ساری گندگیاں انسان کے اعضا سے دل کے اندر پہنچتی رہتی ہیں۔

اب بتاؤ! کہ جو آدمی کپڑے تو ماشاء اللہ بہت اچھے پہنا ہوا ہے اور اسی کے

ساتھ استری (IRON) بھی پڑی ہوئی ہے، اس کے اندر ذرا سی بھی ٹیڑھ نہیں ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کان سے غلط چیزیں سن رہا ہے، غیبتیں سن رہا ہے، گانے بجانے سن رہا ہے، جب گانے سنیں گے، تو گندگی پیدا ہوگی۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا" ألغناء ینبت النفاق" (یعنی گانا بجانا نفاق کو پیدا کرتا ہے) (ابو داؤد: ۴۹۲۷)

کتنی سخت بات ہے!! نفاق کفر کا ہی نام ہے، یعنی کفر، جو دل میں چھپا رہتا ہے اس کا نام نفاق ہے اور اگر وہ اُگل دیا جائے، تو اس کا نام کفر ہے، اندر رہے تو اس کا نام نفاق، باہر آجائے، تو اس کا نام کفر، چیز ایک ہی ہے صرف اندر اور باہر کا فرق ہے۔ الماری کے اندر رکھیں یا الماری کے باہر رکھیں، چیز میں کوئی فرق آئے گا؟ نہیں! چیز ایک ہی رہے گی۔

اب ان کانوں کے ذریعہ گندگی اور نفاق دل کے اندر پہنچ رہا ہے، اب یہ آدمی لوگوں کی نظر میں بہت پاک صاف ہے، اسی طرح آنکھوں اور ہاتھوں پیروں وغیرہ سے کوئی حرام و ناجائز کام کیا، تو وہ انسان ناپاک ہو جاتا ہے اور اللہ کی نظر میں بڑا گندہ ہو جاتا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ظاہری اعضا گناہوں میں ملوث ہیں۔

انگریزوں کی پاکی کا حال

انگریزوں کے بارے میں سنا ہوگا کہ انگریز لوگ پاخانہ کر کے دھوتے نہیں، صرف پونچھ لیتے ہیں؛ لیکن ظاہر میں بڑے اچھے رہتے ہیں، گورے بھی ہوتے ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ لباس اور پوشاک بھی بہت قیمتی اور اچھا ہوتا ہے، استری ڈال ڈال کر پہنتے ہیں، ظاہر کی صفائی کا بڑا اہتمام کرتے ہیں؛ مگر اس ظاہری صفائی کے باوجود ناپاک کے ناپاک ہی رہتے ہیں۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کو گھر صاف کرنا تھا، تو اس نے ایک کپڑے کو پیشاب میں ڈبو کر پورے گھر کو اس کپڑے سے صاف کیا۔ بتاو! گھر پاک ہوا یا مزید ناپاک ہو گیا؟ یہی حال ان انگریزوں کا ہے کہ ظاہر میں تو بہت صاف؛ لیکن اندر دیکھیں، تو بالکل ناپاک۔

اسی طریقے پر جو آدمی عمدہ و پاک کپڑے پہنتا ہے، جسم اپنا پاک کر لیتا ہے؛ لیکن اس کے اعضا گناہوں سے پاک نہیں ہوتے، تو وہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی نظر میں گندہ رہتا ہے۔

''گناہ'' ایک باطنی نجاست

یہاں سے ایک بات سمجھ میں آ گئی کہ گناہ فی الواقع ایک باطنی گندگی و نجاست ہے، اس سے انسان گندہ و نجس ہو جاتا ہے، لوگ اس کو ناپاک و نجس نہیں سمجھتے، اس لیے اس سے بچنے کا اہتمام بھی نہیں کرتے؛ بل کہ گناہ پر گناہ کر کے بھی اپنے کو سب سے زیادہ صاف و پاک خیال کرتے ہیں۔

اب میں قرآن و حدیث سے کچھ دلائل عرض کروں گا، جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ گناہ بھی ایک نجاست ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ ظاہری اعضا سے جب گناہوں کا صدور ہوگا، تو وہ اعضا اللہ اور اس کے رسول اور فرشتوں کی نظر میں گندے شمار ہوں گے۔

گناہ نجس ہے-پہلی دلیل

اب لیجیے! پہلی دلیل، قرآن کریم میں آیا ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [سورۃ المائدۃ: ۹۰]

(اے ایمان والو! بلاشبہ شراب اور جُوّا اور بت (یعنی بتوں کی پرستش، جسے کفر کہتے ہیں) اور قسمت جاننے کے لیے، جو تیر پھینکے جاتے ہیں، یہ سب ناپاکی اور نجاست ہے، شیطان کے کاموں میں سے ہے؛ لہٰذا تم اس سے بچو، شاید تم کامیاب ہو جاو گے۔

دیکھئے! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کو، جوے کو، شرک کو اور قسمت کے تیروں کو "رِجسٌ" (ناپاک) کہا ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی جب شراب پیتا ہے، تو شراب نہیں پیتا؛ بل کہ گندگی و نجاست پیتا ہے، اسی طرح جب جوا کھیلتا ہے، تو اس کے سارے اعضا میں گندگی لگ جاتی ہے اور جب بتوں کی پرستش کرتا ہے، کافرانہ حرکت کرتا ہے، اس کی وجہ سے بھی اس میں گندگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح "أزلام" یہ "زَلَمٌ" کی جمع ہے، تیر کو کہتے ہیں، زمانۂ جاہلیت میں لوگ تیروں کے ذریعہ فال کھولتے تھے، قسمت جاننے کی کوشش کرتے تھے، یہ ایک خواہ مخواہ کی بات تھی، قسمت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، کوئی کیا بتا سکتا ہے، اس میں اس کو بھی نجاست کہا گیا ہے؛ لہٰذا جو لوگ فال کھولتے ہیں، یہ بھی گندگی و ناپاکی سے ملوث ہوتے ہیں۔

اب یہ سب ظاہری اعضا سے ہونے والے گناہ ہیں، کوئی ہاتھ سے، کوئی منھ سے، کوئی دیگر اعضا سے، اللہ نے ان کو رِجس اور گندگی فرمایا، ان ظاہری اعضا سے رجس و گندگی کو جب آدمی پاک کرے گا، تو طاہر بنے گا، یعنی جب ان گناہوں کو چھوڑے گا، تب وہ پاک ہوگا، معلوم ہوا کہ گناہ گندگی کا، نجاست کا نام ہے۔

دوسری دلیل

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

ازواجِ مطہرات کو چند احکام دیے ہیں: ایک گھروں میں رہنے کا، ایک جاہلی انداز سے بے حیائی و بے پردگی سے بچنے کا، ایک نماز کو قائم کرنے کا اور ایک زکوٰۃ دینے کا، پھر فرمایا کہ ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (یہ احکام اس لیے دئے گئے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ تم اہلِ بیت سے گندگی کو دور کردے اور تم کو پاک کردے)[الأحزاب: ۳۳]

غور کیجیے! کہ اس میں چند احکام دینے کے بعد اللہ تعالیٰ ان احکام کو لاگو کرنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ گندگی سے پاک کرنا چاہتے ہیں، یہ کیا گندگی تھی، کوئی ظاہری گندگی یا باطنی؟ ظاہر ہے کہ یہاں گندگی سے مراد ان احکام کے بجا نہ لانے کی صورت میں گناہوں کی وجہ سے، جو گندگی پیدا ہوتی ہے، اس سے پاک و صاف کرنا مراد ہے، معلوم ہوا کہ گناہ و معصیت ایک نجاست و گندگی ہے۔

تیسری دلیل

تیسری دلیل یہ ہے کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيلاً مِنْ نَتْنِ مَا جَاءَ بِهِ" (جب آدمی جھوٹ بولتا ہے، تو اللہ کے فرشتے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے اس سے بہت دور بھاگ جاتے ہیں) (مشکوٰۃ: ۴۱۳)

کیوں بھاگ جاتے ہیں؟ اس کا جواب خود حدیث دے رہی ہے کہ اس جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے، وہ اللہ کے فرشتے اس سے دور ہو جاتے ہیں۔

اب بتاؤ! کہ بدبو گندی چیز سے نکلتی ہے یا اچھی و پاک چیز سے نکلتی ہے؟ ناپاک و گندی چیز سے نکلتی ہے، معلوم ہوا کہ جھوٹ ایک گندگی ہے اور اس گندگی سے ایک بدبو بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ اتنی خطرناک ہوتی ہے کہ اللہ کے فرشتے آدمی سے دور

بھاگ جاتے ہیں۔

حدیث کی عجیب منطقیانہ تشریح

بھائیو! یہاں اس کی ذرا سی تشریح کر دوں، دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں: ایک کو ''جوہر'' کہتے ہیں اور ایک کو ''عرض''، مثلاً کتاب جوہر ہے اور اس پر جو رنگ چڑھا ہوا ہے وہ عرض ہے، عرض کہتے ہیں اس چیز کو جو کسی کے تابع بن کر پایا جاتا ہے، بذاتِ خود مستقل طور پر وہ نہیں پایا جاتا۔ اور جوہر وہ ہے، جو بذاتِ خود پایا جاتا ہے، مثلاً ''رنگ؛ چوں کہ وہ عرض ہے، اس لیے وہ خود کہیں نہیں پایا جاتا؛ بل کہ کسی جوہر کے تابع بن کر پایا جاتا ہے، جیسے کسی کتاب پر ہوگا، کسی دیوار پر ہوگا، کسی کپڑے پر ہو گا، کسی الماری پر ہوگا، جوہر سے الگ صرف رنگ کا وجود کہیں ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا، اسی طرح انسانوں میں بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں، کوئی کالا ہوتا ہے، کوئی گورا ہوتا ہے، کوئی لال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے رنگتیں الگ الگ بنائیں ہیں، یہ رنگ انسان کے جسم پر پایا جاتا ہے، الگ سے کہیں نہیں مل سکتا۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی، تو اب یہ سمجھیے کہ اسی طرح بدبو اور خوشبو بھی عرض ہیں اور یہ بھی کسی نہ کسی جوہر کے تابع بن کر پائے جائیں گے، الگ سے نہیں۔ مثلاً پاخانہ رکھا ہوا ہے اس سے بدبو آ رہی ہے، عطر رکھا ہوا ہے، اس سے خوشبو آ رہی ہے، اگر کوئی نجاست نہ ہو، تو بدبو کے آنے کا کوئی سوال نہیں اور اگر کوئی خوشبودار چیز نہ ہو، تو خوشبو کے پائے جانے کا کوئی سوال نہیں، نجاست نہ ہو اور بدبو آ جائے، کیسے ہو سکے گا؟ عطر نہ ہو، خوشبو آ جائے، کیسے ہو سکے گا؟ ممکن نہیں۔

اب حدیث کو سمجھیے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرما رہے ہیں کہ: ''جب آدمی جھوٹ بولتا ہے، تو اللہ کے فرشتے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے اس سے بہت

دور بھاگ جاتے ہیں'' دیکھیے! جھوٹ کی وجہ سے بدبو آرہی ہے اور بدبو عرض ہے، وہ خود نہیں پائی جاسکتی، اس کے وجود کے لیے جوہر کی ضرورت ہے؛ لہٰذا بدبو آنے کے لیے بدبودار چیز وجوہر کا ہونا ضروری ہے؛ کیوں کہ جب تک بدبودار چیز نہ ہو، بدبو نہیں آسکتی، جیسے خوشبودار چیز نہ ہو، تو خوشبو نہیں آسکتی اور جب تک کتاب یا اور کوئی جوہر نہ ہو، تو رنگت نہیں مل سکتی۔

معلوم ہوا کہ جب آدمی جھوٹ بولتا ہے، تو پہلے نجاست اس کے منہ میں پیدا ہو جاتی ہے؛ پھر اس سے بدبو آتی ہے، وہ بدبو جب اللہ کے فرشتے سونگھتے ہیں، تو بھاگ جاتے ہیں، یہ نکتہ ہے، جس کو میں سمجھانا چاہتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ جھوٹ ایک نجاست ہے، گندگی ہے؛ لیکن ہم لوگ اس جھوٹ کو نجاستوں میں شمار نہیں کرتے۔ اسی طرح قیاس کیجیے تمام گناہوں کو، آدمی جو بھی گناہ کرتا ہے، وہ سب گندگیاں اور نجاستیں ہیں۔

چوتھی دلیل

گناہ کے نجاست ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فرمایا کہ وہ ایسی ہیں، یہ کہہ کر انگوٹھے سے اشارہ کیا (یعنی وہ پست قد ہیں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''عائشہ تو نے جوان کی غیبت کی ہے، وہ ایسی گندی ہے کہ اس گندگی کو سمندر میں بھی ڈال دو، تو سمندر بھی گندا ہو جائے۔

(ترمذي: ۲۵۰۲، ابو داؤد: ۴۸۷۵، مسند أحمد: ۱۸۹/۶)

اب یہاں دیکھیے! کہ غیبت کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نجاست ٹھہرا رہے

ہیں۔معلوم ہوا کہ غیبت بھی نجاست ہےاور گندگی کا نام ہے۔

تو ان دلیلوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں گناہ ناپاکی ونجاست کا نام ہے۔ہم اگر ظاہری اعضا سے ظاہری گناہوں کو پاک وصاف نہ کریں، تو ہم نہا کر، دھو کر، خوشبو لگا کر، ظاہری اعتبار سے معطر ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور فرشتوں کی نظر میں گندے شمار کیے جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ ظاہری اعضا سے ظاہری گناہوں کو صاف و پاک کرنا، دوسرے نمبر کی طہارت ہے۔

ظاہری گناہوں سے کیسے بچیں؟

اس طہارت کو حاصل کرنے کی بھی اسی طرح ضرورت ہے، جس طرح پہلی طہارت کی ضرورت ہے؛ بل کہ اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ﴾ [الأنعام: ۱۲۰] (ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہ چھوڑ دو، بے شبہ جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کو ان کے کیے کا بدلہ عنقریب دیا جائے گا۔)

بھائیو! اس آیت میں ظاہری و باطنی دونوں قسم کے گناہوں کو چھوڑ دینے کا حکم سنایا گیا ہے؛ لہٰذا ان سے پرہیز کرنا چاہیے اور ان کی گندگی سے بچنا چاہیے۔

مگر ان سے کیسے بچیں؟ انسان جب گناہ کا عادی ہو جاتا ہے، تو اس سے اس کا چھوٹنا مشکل ہو جاتا ہے، وہ بار بار کوشش کرتا ہے، مگر اس سے بچنے میں کامیاب نہیں

ہوتا، اس لیے پریشان ہو جاتا ہے؛ مگر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ گناہوں سے بچنے کے لیے اور ان کی عادت نکالنے کے لیے کچھ تدبیریں اختیار کرنا پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

پہلی تدبیر-عزم وہمت

ان تدبیروں میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے اندر ترکِ گناہ کی ہمت اور اس کا عزم پیدا کرے؛ کیوں کہ دین و دنیا کا کوئی بھی کام عزم وہمت کے بغیر پورا نہیں ہوتا، معمولی سے معمولی کام بھی عزم و ہمت پر موقوف ہے، آپ کھانا کھانا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے بھی ہمت چاہیے، ورنہ آدمی کھانا بھی کھانے سے رہ جاتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ''ہمتِ مرداں مددِ خدا'' یعنی جب مرد لوگ ہمت کرتے ہیں، تو اللہ کی مدد آتی ہے اور ان کا کام بنا دیا جاتا ہے؛ اس لیے یہ ہرگز نہ سوچے کہ میں گناہ نہیں چھوڑ سکوں گا، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا؛ بل کہ ہمت کر کے یہ عزم کر لیجیے کہ میں ضرور گناہ پر قابو پالوں گا، ان شا اللہ ایک نہ ایک دن آپ اس میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دوسری تدبیر-توفیق کی دعا

دوسری تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے گناہ چھوڑنے کی توفیق مانگے؛ کیوں کہ اللہ کی توفیق ہی سے ہم اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں، اگر وہاں سے توفیق نہ ملی، تو کچھ نہ ہو سکے گا؛ اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں گناہ سے بچنے کی توفیق کا بھی سوال کرتے تھے۔

ایک دعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد آئی کہ آپ نے فرمایا: '' اَللّٰھُمَّ إِنِّيٓ أَسْئَلُکَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَ تَرْکَ الْمُنْکَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاکِیْنِ

الخ (اے اللہ! میں تجھ سے نیک کاموں کے کرنے کی اور برے کاموں کو چھوڑنے کی اور مساکین سے محبت رکھنے کی توفیق مانگتا ہوں)

ایک اور لمبی دعا میں یہ فرمایا ہے کہ "اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُکَ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِکَ تَعْصِمُنِيْ بِھَا مِنْ کُلِّ سُوْءٍ" (اے اللہ! میں تجھ سے تیری خاص رحمت مانگتا ہوں، جس سے تو مجھے ہر برائی یا ہر گناہ سے محفوظ فرمادے)

ان دعاؤں میں اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اللہ تعالیٰ سے ترکِ گناہ کے لیے اس کی توفیق کا سوال کیا ہے، اسی طرح ہمیں بھی اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر مانگنا چاہیے کہ اے اللہ! تیری ہی توفیق سے ہم گناہ سے بچ سکتے ہیں؛ اس لیے تو ہی توفیق عطا فرما۔

تیسری تدبیر-صحبتِ کاملین

ایک اہم تدبیر یہ ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کی جائے، یہ کیمیا ہے اور انتہائی مُجرّب نسخہ ہے؛ کیوں کہ صحبت کی تاثیر تو ایک مُسلَّم حقیقت ہے، اس سے تو کوئی انکار ہی نہیں کرسکتا اور اہل اللہ کی صحبت میں تاثیر بھی زبردست ہوتی ہے، شرابی کبابی اور بڑے بڑے بدمعاش ان کی صحبت سے بڑے بڑے اولیاء اللہ بن گئے ہیں، یہ کوئی فرضی بات نہیں؛ بل کہ ایک مشاہداتی چیز ہے، جس کا لوگوں نے بارہا تجربہ کیا ہے؛ لہٰذا گناہ سے بچنا ہو، تو اس کو بھی ایک تدبیر کے طور پر اختیار کرو اور دیکھو کہ کیا اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

اور ان کی صحبت کا مؤثر ہونا اس طرح بھی ہوتا ہے کہ ان سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہم کس طرح گناہوں کو چھوڑ سکتے ہیں، اس کی کیا تدبیر ہے؟ پھر اس پر عمل کرنے سے ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کی انوکھی تدبیرِ اصلاح

اس پر مجھے ایک بات یاد آ گئی، اس کو بھی سن لیجیے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ایک مرید تھے، انھوں نے ایک دفعہ آپ کو خط لکھا کہ میری آنکھیں بے اختیار غلط چیز یعنی نامحرموں کی طرف اٹھ جاتی ہیں؛ لہٰذا کوئی علاج بتائیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جواب لکھا کہ اگر بے اختیار اٹھ جاتی ہیں، تو آپ کو فکر کی کیا ضرورت ہے، آپ پریشان کیوں ہیں؟ اٹھنے دیجیے؛ کیوں کہ غیر اختیاری کام پر کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔

اس جواب سے ان کو احساس ہوا کہ میں نے غلط بیانی کی ہے، بے اختیار آنکھیں نہیں اُٹھتیں؛ بل کہ اختیار سے ہی اُٹھتی ہیں؛ لہٰذا دوسرا خط لکھا کہ حضرت! بے اختیار تو نہیں، اختیار سے ہی اٹھتی ہیں؛ لیکن نگاہ اٹھنے کے بعد نیچی کرنے کی طاقت نہیں پاتا۔ اس کا جواب حضرت رحمہ اللہ نے لکھا کہ یہ بات بھی تمہاری غلط ہے، اس لیے کہ فلسفے کا یہ مانا ہوا اصول ہے کہ کسی بھی چیز کا اختیار دونوں طرف سے متعلق ہوتا ہے، طرفین سے متعلق ہوتا ہے، یعنی آدمی اگر کوئی کام کرسکتا ہے، تو وہ اس کام کو نہ کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہے، ایسا نہیں کہ کر تو سکے؛ لیکن نہ کرنے کی طاقت نہ رہے، ایسا نہیں ہوسکتا، میں یہ چیز اٹھا رہا ہوں، اگر چاہوں تو نہ اٹھاؤں، دونوں باتیں اختیار میں ہوتی ہیں، یہ کیسے کہ نگاہ اٹھ تو گئی، اب نیچی نہیں کرسکتا۔

اس پر ان صاحب کو پھر اپنی غلطی کا احساس ہوا اور تیسرا خط حضرت کو لکھا، اس میں انھوں نے لکھا کہ حضرت! معافی چاہتا ہوں، پھر غلطی ہوئی، نگاہ کو بچانے کی طاقت تو ہوتی ہے؛ لیکن ہمت نہیں ہوتی ہے۔

حضرت رحمہ اللہ نے کہا کہ ہاں! یہ صحیح ہے، بہت سے لوگوں کو طاقت تو ہوتی ہے؛ لیکن ہمت نہیں کرتے اور ہمت ہی سے تو سب کچھ ہوتا ہے، آدمی ہمت کرے

تو پہاڑ کو ریزہ ریزہ کردے، اگر آدمی کوشش کرے اور ہمت کرے، تو معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جائے، یہ ہمت ہی تو ہے کہ آج پوری دنیا کہاں سے کہاں پہنچی ہوئی ہے، اگر ہمت نہ کرتے، تو یہ دنیا یہاں تک کیسے پہنچتی اور اس کے اندر اتنی تبدیلی کہاں سے آتی، تو ہمت سے بہت کچھ ہوتا ہے۔

الغرض! حضرت رحمہ اللہ نے ان کو لکھا کہ آپ کی اصل بیماری ہمت میں کمی ہے، اچھا ٹھیک ہے؛ لیکن یہ فرمایئے کہ اگر میں بھی اس وقت تمہارے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں، تب بھی ایسا ہی ہوگا کہ غیر محرموں کو دیکھتے رہوگے اور یہ کہوگے کہ بچنے کی ہمت نہیں ہوتی، نگاہ نیچے کرنے کی ہمت نہیں ہوتی؟

اس پر ان صاحب کا خط آیا کہ حضرت !اگر آپ ساتھ ہوں، تو ایسا نہیں ہوگا؛ بل کہ پھر تو نگاہیں نیچی ہو جائیں گی۔ پھر حضرت نے ان کو جواب لکھا کہ جب میرے ساتھ ہونے کے خیال سے تمہاری نگاہیں نیچی ہوسکتی ہیں، تو خالقِ دو جہاں کے ساتھ ہونے کے تصور سے نگاہ کیوں نیچی نہیں ہوسکتی؟

یہ ہے اصلاح کا طریقہ، عجیب وغریب طریقے سے اصلاح ہوتی ہے، اگرچہ کئی کئی خطوط کا تبادلہ ہوتا تھا؛ لیکن بات دل میں اچھی طرح پیوست ہوجاتی تھی۔ تو بتانے کی بات یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ان سے اصلاح کے نسخے معلوم ہوں گے اور ہم اپنی اصلاح کرنے میں اور گناہوں سے بچنے میں کام یاب ہوسکیں گے۔

ایک سالک کا عبرت خیز واقعہ

ایک بات اور یاد آگئی کہ ایک سالک نے مجھے سنایا کہ جب مجھ سے پہلے پہلے کہا جاتا تھا کہ اپنی نگاہوں کو پست رکھو اور نامحرموں کو نہ دیکھو، تو میرے دل میں یہ

آتا تھا کہ یہ مجھ سے کہا تو جا رہا ہے؛ لیکن کیا یہ کہنے والے بھی اس پر عمل کرتے ہیں؟ یا بس ویسے ہی کہہ دیا کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ میں سمجھتا تھا کہ یہ کہنے والے بھی شاید اس پر عمل نہ کرتے ہوں؛ کیوں کہ مجھے یہ بات بہت ہی ناقابلِ عمل معلوم ہوتی تھی کہ ایک حسین و جمیل عورت سامنے ہو اور اس کو نہ دیکھوں!! مگر میں نے یہ سوچ لیا کہ مجھ سے جو کہا جا رہا ہے، اس پر مجھے عمل کرتے رہنا چاہیے تاکہ دیکھوں کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ سالک کہہ رہے تھے کہ میں برابر عمل کرتا رہا اور اب میری حالت یہ ہے کہ الحمدللہ! میری آنکھیں نامحرم کے سامنے آتے ہی خود شرم سے جھک جاتی ہیں اور اللہ کے خوف کی وجہ سے اس کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی، کہنے لگے کہ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ مجھے نامحرموں سے نگاہ بچانے کا حکم دینے والے بھی ضرور اس پر عمل کرتے ہوں گے، اس لیے کہ اب مجھے خود بھی اس کی عادت و ہمت ہو چکی ہے۔

میرے بھائیو! صحبتِ اہل اللہ کا یہ اثر دیکھیے اور عبرت حاصل کیجیے اور اس سے یہ بھی سمجھ لیجیے کہ جب تک آدمی عمل نہیں کرتا اور شیخ کی بات پر مقلدِ محض بن کر نہیں چلتا اسے ساری بات سمجھ میں نہیں آتی، دیکھو ان صاحب کو شیخ کی بات پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آئی کہ کیسے عورت سے نگاہ بچائیں اور کیا یہ ممکن بھی ہے یا نہیں؛ لیکن جب شیخ کی بات پر بلا سمجھے ہی عمل شروع کر دیا، تو پھر بات سمجھ میں بھی آ گئی اور پتہ چل گیا کہ وہ پہلے کس قدر جہالت میں تھے۔

طہارت کی تیسری قسم

اب آیئے آگے چلیں؛ طہارت کی تیسری قسم یہ ہے کہ باطنی اعضا کو باطنی گناہوں سے پاک کیا جائے۔ باطنی اعضاء کیا ہیں؟ دل و دماغ، ان سے جو گناہ

ہوتے ہیں ،ان گناہوں سے اپنے آپ کو پاک وصاف کرلینا تیسرے نمبر کی طہارت ہے۔

دل کی بیماریاں کیا ہیں؟

دل میں بھی بہت سے گناہ پیدا ہوتے ہیں،تکبر پیدا ہوتا ہے،عُجب پیدا ہوتا ہے،ریاکاری پیدا ہوتی ہے،حسد پیدا ہوتا ہے،بغض پیدا ہوتا ہے،جلن پیدا ہوتی ہے،حبِ دنیا ،حبِ مال و دولت، یہ سارے گناہ دل سے ہوتے ہیں، دل کے گناہوں سے اگر آدمی اپنے آپ کونہیں بچائے گا،تووہ بھی اللہ کی نظر میں گندہ ہے اوراس کا دل بھی گندہ اورناپاک ہے؛ لہٰذا اسے پاک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

آج ہم لوگ پوری محنت ظاہر پر صرف کرتے ہیں ،اسی کے اوپر پوری توجہ صرف کرتے ہیں کہ ہماراظاہر پاک ہوجائے ،اگر ہمارے چہرے پرداغ آجائیں، تو ہم پریشان ہوجاتے ہیں اوران کونکالنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں؛ لیکن دل کے اوپر کتنی بھی گندگی آجائے ،ناپاکی لگ جائے ،داغ ودھبے لگ جائیں ،تواس کا ہمیں کوئی احساس نہیں ہوتا؛ حالاں کہ دل کی صفائی کا خاص الخاص اہتمام کرنا چاہیے تھا۔

زنگ آلود دل

کیوں کہ دل پر ہمارے گناہوں کا اثر ہوتا ہے اوروہ کالا اورزنگ آلود ہوجاتا ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے، تواس کے دل کے اوپر ایک دھبہ لگتا ہے، اگر وہ سچے پکے دل کے ساتھ توبہ کرتا ہے،تووہ صاف ہوجاتا ہے؛ لیکن اگراس نے توبہ نہیں کی اور گناہ پر گناہ کرتا رہا،تواس کے وہ داغ، دھبے بڑھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک زمانہ

ایسا آتا ہے کہ پورا دل کالا ہو جاتا ہے۔ یہ فرما کر آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے کہا کہ قرآن میں اللہ نے اسی کا ذکر اس آیت میں کیا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (ہرگز نہیں! ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے)۔

(ترمذي، الرقم: ١٠٥)

دیکھیے! اس حدیث میں اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے صاف بتایا ہے کہ دل پر گناہ کا اثر ہوتا ہے کہ وہ زنگ کی وجہ سے کالا ہو جاتا ہے، اگر فوراً توبہ کر لیا، تو وہ زنگ دور ہو جاتا ہے، ورنہ وہ بڑھتے بڑھتے سارے دل کو کالا و زنگ آلود کر دیتا ہے۔

دل کا زنگ کیسے پاک ہوگا؟

یہ دل کا زنگ اور کالک کیسے دور ہوگی؟ اس کا جواب ایک حدیث میں وارد ہوا ہے، وہ یہ کہ ایک موقعے پر آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: ”إِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ“ (بلا شبہ ان دلوں پر زنگ آجاتا ہے، جیسے لوہے پر زنگ آجاتا ہے، جب اسے پانی لگ جاتا ہے) صحابہ رَضِيَ اللهُ عَنْهُم نے پوچھا: ”وَمَا جِلاَ ئُهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!“ (کہ اس زنگ کو صیقل کس طرح کیا جا سکتا ہے؟) تو آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: ”كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ“ (موت کی یاد اور تلاوتِ قرآن کی کثرت)۔ (مشکوٰۃ: ١٨٩)

لہٰذا دل کے زنگ کو اس طرح دور کرنا چاہیے کہ موت کو یاد کیا کریں اور قرآن کی کثرت کے ساتھ تلاوت کیا کریں۔

حضرت مسیح الامت رَحِمَهُ اللهُ کی ایک تقریر کا خلاصہ

مجھے میرے حضرت مسیح الامت رَحِمَهُ اللهُ کی ایک تقریر یاد آ گئی، وہ یہ کہ آپ

نے ایک دفعہ ایک حدیث پڑھی کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: ’’اپنے گھروں کو صاف کرنے کے بعد یہودیوں کی طرح اپنے صحن کو ناپاک نہ رکھو، اس لیے کہ یہودی ایسے ہی کرتے ہیں‘‘۔ (مشکوٰۃ: ۳۵۸)

یہ حدیث سنا کر حضرت رَحِمَهُ اللهُ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم گھر کے باہر کے حصے کو بھی ناپاک اور گندہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتے اور اس کو بھی صاف کرنے کا حکم دیتے ہیں، تو گھر کی صفائی کرنے کا تو بدرجۂ اولیٰ حکم ہوگا اور جب گھر کی صفائی کا حکم ہے، تو ہمارے کپڑوں کو صاف کرنے کا تو اس سے زیادہ حکم ہوگا، اس لیے کہ گھر تو ہم کو لگا ہوا نہیں رہتا، کپڑے تو ہمارے جسم سے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ جب کپڑوں کی صفائی کا حکم ہے، تو وہ جسم جس کے لیے کپڑے ہیں، وہ کیوں پاک نہیں ہونے چاہئیں؟ وہ تو اس سے زیادہ پاک ہونے چاہئیں اور جب ظاہری جسم کو پاک کرنے کا حکم ہے، تو اس جسم کا جو اصل ہے یعنی اندورن و باطن جس کو قلب کہتے ہیں، اس کی صفائی تو سب سے زیادہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ قلب اصل ہے، ظاہری جسم اس کی سواری کی طرح ہے، تو جب ظاہری جسم ہی کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے، تو اندر والے کو کیوں حکم نہیں ہوگا کہ وہ پاک وصاف رہے۔

جیسے کار کو دھونے کا حکم ہو، تو اندر کار میں بیٹھنے والے صاحب کیا پاخانہ سے ملوث رہیں گے؟ بھائیو! جب ہم کار کے بارے میں چاہتے ہیں کہ اس کی ویل بھی پاک ہو اور اس کا اوپر والا حصہ بھی صاف ہو، پیچھے کیچڑ نہ لگا ہو، سامنے کچھ نہ لگا ہو، دھول نہ لگی ہو، تو کیا ہم کار کے اندر ایسے شخص کو بٹھانا گوارا کریں گے، جو ایک گندے

نالے میں ڈوبا ہوا ہو؟ کیا کوئی اس کو سیدھے لاکر سیٹ پر بٹھادے، تو ہم گوارا کریں گے؟ نہیں! اسی طرح جسم تو ہو صاف؛ مگر دل ہو گندہ، تو اللہ کو یہ کیسے پسند آئے گا؟

جب اوپر کے حصے کو اتنا صاف کر رہے ہیں، تو اندر بیٹھنے والا تو سب سے زیادہ صاف ہونا چاہیے ۔جب ہمارے جسم کو ہم صاف کر رہے ہیں، جو کہ کار کے مانند ہے، تو اندر جو کار میں بیٹھنے والا ہے، یعنی دل وہ تو اس سے زیادہ پاک وصاف ہونا چاہیے۔

تکبر دل کی سب سے بڑی بیماری

دل کی بہت سی گندگیاں اور بیماریاں ہیں، جن سے دل کو پاک کرنا ضروری ہے۔میں مثال کے طور پر بعض اہم بیماریوں کا تذکرہ کرتا ہوں، ان بیماریوں میں تکبر سرِ فہرست ہے، یعنی اپنے آپ کو کسی دینی یا دنیوی کمال میں بڑا سمجھنا اور دوسرں کو حقیر سمجھنا۔ اور تکبر عربی لفظ ہے اور بابِ تفعل سے ہے اور اس باب کی ایک خاصیت تکلف ہے، مطلب یہ ہے کہ آدمی حقیقت میں تو بڑا نہیں ہوتا؛ مگر اپنے آپ کو بڑا بنا کر پیش کرتا ہے اور بڑا سمجھتا ہے ۔تکبر کی وجہ سے آدمی کا دل ناپاک ہو جاتا ہے، شیطان شیطان اسی لیے بنا کہ اس کے اندر تکبر تھا، ورنہ تو وہ بڑا عابد تھا، بڑا زاہد تھا، عالم تھا؛ لیکن تکبر نے اسکو خاک کردیا، یہاں تک کہ اس کو آسمانوں سے اُتار کر دنیا میں بھیج دیا؛ بل کہ پھینک دیا گیا۔

اب یہاں یہ بھی سمجھتے چلیے کہ تکبر سب سے بڑی بیماری کیوں؟ علما نے لکھا ہے کہ تکبر کی حقیقت دو چیزیں ہیں: ایک ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسرا، دوسروں کو حقیر سجھنا۔ان دو چیزوں سے تکبر پیدا ہوتا ہے اور اگر ان دو میں سے صرف ایک چیز، آپ کو بڑا سمجھنے کی بات پائی جائے، تو اس کا نام عُجب ہے، وہ بھی ایک برا خُلق

اور بڑی بیماری ہے اور دل کی بیماریوں میں سے ایک خطرناک بیماری ہے، اگر صرف دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے، اپنے کو بڑا نہیں سمجھتا، تو یہ دوسرے آدمی کی توہین وتذلیل ہے، یہ بھی اسلام میں ناجائز ہے۔

اور اگر دونوں باتیں ہوں کہ خود کو سب سے اچھا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، تو اس کا نام تکبر ہے، معلوم ہوا تکبر کے دو جزو ہیں، دونوں جمع ہوں، تو بھی خراب اور اگر الگ الگ پائے جائیں، تو بھی خراب؛ ظاہر ہے کہ جب ان دو میں سے ہر بیماری خطرہ ہے، تو دونوں کسی میں جمع ہو جائیں، تو کیا اس کا خطرہ اور بڑھ نہیں جائے گا؟ اسی لیے اس کو سب سے زیادہ خطرناک بیماری کہا گیا ہے اور ''ام الامراض'' نام دیا گیا ہے۔

بڑائی اللہ جل جلالہ ہی کو سزاوار ہے

اس کے ساتھ ایک اور وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے، وہی اس کا مستحق ہے کہ وہ بڑائی جتائے اور تکبر کرے، کسی بندے کو کیا حق ہے کہ وہ تکبر کرے؟ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **"الكبرياء ردائي والعظمة إزاري، فمن نازعني واحدا منهما قذفته في النار"** (کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار ہے، پس جو شخص ان میں سے کسی میں بھی میرے سے جھگڑے گا، تو میں اس کو دوزخ کا عذاب چکھاؤں گا''۔ (ابو داؤد: ۴۰۹۰، واللفظ له، ابن ماجه: ۴۱۷۴، مسند أحمد: ۲/۴۱۴، صحيح ابن حبان: ۲/۳۵)

مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کی شان ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے؛ اس لیے کہ ساری کائنات کا ہر ذرہ اس کا محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں اور ساری کائنات

بے قدر و بے حقیقت ہے اور اللہ ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہے؛ اس لیے تکبر اس کی صفت ہے اور جو اس کی صفت میں شریک ہونا چاہے، گویا وہ اللہ کی صفت میں اپنے کو شریک کر کے شرک کرنا چاہتا ہے، اس لیے اللہ اس کو عذاب دیتے ہیں، اس لیے کہ اس کے برابر کوئی نہیں نہ ذات میں نہ ہی صفات میں۔

تکبر کا ایک علاج

تکبر میں آج ہر آدمی مبتلا ہے، جوان ہو یا بوڑھا، عورت ہو یا مرد، امیر ہو یا غریب۔ ایک نوجوان متکبر کا قصہ یاد آیا کہ ایک بزرگ نے اس کو غلط کام کرنے کی وجہ سے ٹوکا تو وہ غصہ میں آ گیا اور کہنے لگا کہ اچھا! مجھے آپ نصیحت کرتے ہیں؟ معلوم ہے میں کون ہوں؟ (یہ جملہ آج لوگوں کے درمیان ایک فیشن بنا ہوا ہے، ہر شخص کہتا ہے کہ جانتے ہو، میں کون ہوں؟ جب آدمی میں تکبر ہوتا ہے، تو یہ جملے کہتا ہے، یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔)

اس پر ان بزرگ نے کہا کہ ہاں! ہاں! اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو ایک زمانہ نطفۂ ناپاک تھا، گندہ پانی، منی کا ناپاک قطرہ تھا اور ایک زمانہ پھر ایسا آئے گا کہ تو مر جائے گا، تو جیفۂ ناپاک ہو جائے گا، مردار بنا پڑا ہوگا اور فی الحال تیری حالت یہ ہے کہ پانچ سات کلو پاخانہ اپنے پیٹ میں لیے پھر رہا ہے۔ یہ ہے تیری حالت، جو میں جانتا ہوں۔ حضرت نے اس سے پوری حقیقت واضح کر دی اور اس کا سارا تکبر توڑ دیا اور دماغ کا سارا خناس نکال دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ قرآن میں فرمایا ہے: ﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾ [یٰس: ۷۷] (کیا آدمی یہ نہیں دیکھتا، غور و فکر نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو ناپاک قطرے سے بنایا اور بڑا ہو کر یہ ہم سے ہی

جھگڑتا ہے)

یہ کمال تو اللہ کا ہے، تیرا کیا کمال ہے؟ تیری حقیقت تو نطفۂ ناپاک ہے، پتہ نہیں کہاں پڑا ہوا تھا گندگی میں، اللہ نے نکال کر تیرے اندر یہ صلاحیت وخوبی بخشی، ماں کے رحم میں داخل کیا، ماں کے رحم میں بنایا؛ پھر ماں کے رحم سے باہر نکالا اور دن بدن پروان چڑھایا اور تربیت کی، یہاں تک کہ تیرے اندر بہت ساری چیزیں ودیعت فرما کر ایک بہترین انسان بنا دیا اور یہ انسان جب بڑا ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ہی سے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ کہاں ہے اللہ بتاؤ؟ واہ میاں واہ! پیدا کیا، بنایا، کھلایا، پلایا، صلاحیت وخوبیاں بخشیں، اتنا سب کچھ دیکھ کر کہتا ہے کہاں ہے اللہ؟

تو یہ تکبر جب آجاتا ہے آدمی کے اندر، تو اس طرح کی بیماریاں اس کے اندر پنپنے لگتی ہیں، پھلنے پھولنے لگتی ہیں اور آگے چل کر وہی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ دوزخ میں بھیجا جاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " **لا يدخل الجنة أحد في قلبه مثقال حبّة من خردل**"

(جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو، وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

(ابن ماجه:۴۱۶۳، مسلم : ۱۳۱ ،ترمذي: ۱۹۹۹ ، ابوداؤد : ۴۰۹۱)

جنت میں داخل نہیں ہوگا، تو پھر کیا ہوگا؟ ظاہر سی بات ہے جہنم میں داخل ہوگا، وہاں اس کی صفائی ہوگی۔

جہنم باطنی بیماریوں کا ہسپتال ہے

یہ بھی اللہ نے مسلمانوں کے لیے کرم فرمایا ہے کہ ان کی صفائی کا وہاں ایک مرکز

جہنم کی شکل میں قائم کر دیا ہے، گویا کہ بیماریوں کو صاف کرنے کے لیے ایک ہسپتال بنا دیا ہے، جہنم بیک وقت دو کام کرتی ہے، کافروں کے لیے قید خانہ ہے اور مؤمنوں کے لیے ہسپتال، جیسے ہسپتال میں آدمی کو داخل کریں، تو کیا ہوتا ہے؟ صفائی ہوتی ہے اور اس کی بیماریوں کو دھو کر صاف کر کے اسے ٹھیک ٹھاک بنا کر، پھر بڑے اعزاز کے ساتھ ڈاکٹر صاحبان اسے ایمبولنس (AMBULANCE) میں بٹھا کر گھر بھیجتے ہیں۔

اسی طریقے پر اللہ تعالیٰ مومن بندے کو جہنم میں داخل کر کے اسے اچھی طرح پاک وصاف کرتے ہیں، جب پاک وصاف ہو جاتا ہے، تو پھر اسے جنت میں بھیج دیا جاتا ہے؛ لیکن جب تک ٹھیک نہیں ہوتا اس وقت تک تو جہنم میں رہنا پڑے گا۔

یہاں ایک اور بات ذہن میں آتی ہے، وہ یہ کہ اللہ نے دو ہسپتال بنائے ہیں، ایک ''اختیاری ہسپتال''، ایک ''اضطراری ہسپتال''، دنیا اختیاری ہسپتال ہے، آپ یا تو دنیا ہی کو اپنا ہسپتال بنالیں اختیاری ہسپتال، چاہے تو خود ہی دنیا میں کسی کو اپنا شیخ ورہبر بنا کر اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دل کی، دماغ کی، اپنے ظاہر کی، باطن کی اصلاح کر کے صاف، پاک ہو جایئے، جب اس طرح یہیں پاک وصاف ہو جائیں گے، تو اللہ کے فرشتے موت کے وقت آ کر کہیں گے ﴿ يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴾ (اے نفسِ مطمئنہ! لوٹ جا اپنے پروردگار کی طرف، اس حال میں کہ اللہ تیرے سے راضی اور تو اللہ سے راضی ہو، میرے نیک بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا) (الفجر: ۲۷ تا ۳۰)

کیوں کہ اب یہ نفس اصلاح پا کر، پاک وصاف ہو کر نفسِ مطمئن ہو گیا، پوری طرح صاف وپاک، بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے؛ لہٰذا یہ ''نفس'' مطمئنہ ہے؛ لیکن

جس نے یہ کام دنیا میں نہیں کیا، تو اضطراری ہسپتال میں وہاں داخل کیا جائے گا، ہم مانیں تو بھی جانا پڑے گا، نہ مانیں تو بھی جانا پڑے گا۔ یہاں جس نے اپنی غفلت اور لاپرواہی سے اپنا علاج نہیں کرایا ہوگا، اللہ کا آرڈر ہوتا ہے کہ ہماری گورنمنٹ ہسپتال بھی تو موجود ہے، یہ پرائیویٹ ہسپتال میں علاج کو نہیں گیا تھا، تو گورنمنٹ ہسپتال میں داخل کریں گے اور وہاں کے فرشتے اس کا علاج کریں گے، گندگیوں اور نجاستوں کو صاف و پاک کر کے، ٹھیک ٹھاک کر دیں گے؛ پھر اسے کہا جائے گا کہ چلو اب اپنے اصلی مقام پر چلو اور جنت میں رہو۔

ایک علمی نکتہ

ابھی میں نے عرض کیا کہ موت کے وقت نفسِ مطمئنہ سے اللہ کے فرشتے کہیں گے: ﴿ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ﴾ کہ تو لوٹ جا اپنے رب کی طرف، اس میں بھی ایک نکتہ ہے، وہ یہ کہ نفسِ مطمئنہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ "اذهبي إلى ربک" کہ تم اپنے رب کی طرف جاؤ؛ بل کہ یہ کہا کہ "لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف"؛ اس لیے کہ ہم وہیں سے یہاں دنیا میں آئے ہوئے ہیں، ہم یہاں کے رہنے والے نہیں؛ بل کہ جنت ہی کے رہنے والے ہیں؛ اس لیے کہا جائے گا کہ واپس اپنی مقام وطن کو چلو۔ یہ دیکھیے! یہ "حافظ احمد وحید صاحب" بنگلور کے مدرسہ سے آئے ہیں، اب ان کو ہم جاؤ نہیں کہیں گے؛ بل کہ یہ کہیں گے کہ "لوٹ جاؤ" اس لیے کہ وہیں سے آئے ہیں، اب وہیں چلے جاؤ، واپس ہو جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہیں سے ہم سب آئے تھے اور وہاں سے یہاں کچھ ترقی کے لیے آئے تھے، کچھ ڈگریاں پاس کر کے جانے کے لیے آئے تھے، جب یہاں ٹھیک ٹھاک ہو گئے اور ان کو حاصل کر لیا، تو اب کہا جا رہا ہے کہ "اپنے رب کی طرف

لوٹ جایئے، اس حالت میں کہ اللہ تم سے راضی ہے اور تم اللہ سے راضی ہو، پہلے آیا تھا تو یہ صفت حاصل نہیں تھی، اب اس صفت کے ساتھ متصف ہو کر لوٹ جا۔

یہ کب ہوگا؟ جب دنیا کی اختیاری ہسپتال میں رہ کر اس نے کسی رہبر کو رہبر بنا کر اپنے آپ کو پاک وصاف کر کے نفسِ امارہ کو نفسِ مطمئنہ بنالیا ہوگا، تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کا فرشتہ یہ اعلان کرے گا اور تسلی دے کر یہاں سے روح قبض کر کے لے جائے گا۔

ایمان جنت کا ویزا (visa) ہے

ایمان جنت کا ویزا ہے، جنت کا ویزا آپ نے لے رکھا ہے؛ لیکن جنت کا ویزا لے کر آپ جنت میں جانے کے لیے پہنچیں گے، تو وہاں پہلے ٹیسٹنگ (TESTING) ہوگی، جیسے ویزا آنے کے بعد انڈیا سے سعودی عرب جانا چاہیں، تو آپ کو کہا جائے گا کہ ڈاکٹر سے میڈیکل سرٹیفکیٹ لاؤ، پھر ڈاکٹر لکھ کر دے گا کہ ہاں ان کو کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے، تب وہ ویزا اُوکے (ok) کر کے آپ کو اندر جانے کی اجازت دے گا؛ لیکن اگر بیماری ہے، تو کہہ دیا جائے گا کہ نہیں جناب! ہمارے پاس بالکل ٹھیک ہو کر آیئے، ورنہ نہیں آسکتے، آپ کو یہ بیماری ہے، جب تک وہ بیماری آپ کی صاف نہیں ہوگی، آپ ٹھیک نہیں ہوں گے، ہمارے ملک میں داخلہ نہیں ہوسکتا۔

اسی طریقے پر جب یہاں سے آدمی چلا جائے گا، ایمان کا ویزا لے کر جنت میں جانا چاہے گا، تو اسے روک دیا جائے گا کہ جناب! آپ ابھی اس قابل نہیں ہیں، پہلے ذرا ہسپتال یعنی جہنم کی ہوا کھایئے، آپ وہاں پاک وصاف ہو جایئے، جب پاک وصاف ہو جائیں گے، تب اس میں داخلہ ملے گا۔

الغرض! آپ کے پاس ایمان جو کہ جنت کا ویزا ہے، وہ تو ہے ہی، اسے او. کے (ok) بعد میں کیا جائے گا، اسے پہلے جہنم کی ہوا کھلائی جائے گی اور وہاں فرشتے اسے پاک وصاف کریں گے، اگر یہیں دنیا میں یہ پاکی وطہارت کا کام کرلیتا، تو بہت اچھا ہوتا؛ لیکن جب یہاں دنیا میں صفائی نہیں کرایا؛ تو وہاں فرشتے ڈنڈے مار مار کر اس کی صفائی کریں گے، جہنم کی سختیوں کے ساتھ، مصائب و پریشانیوں کے ساتھ، سارے عذابات کے ساتھ وہاں صاف کیا جائے گا، اس لیے کہ اس نے اختیاری مجاہدہ نہیں کیا تھا؛ اس لیے اب اضطراری مجاہدہ کرنا پڑے گا۔ جب وہاں وہ پاک وصاف ہو جائے گا، تو جنت میں داخلہ ملے گا۔

جہنم بھی اہلِ ایمان کے حق میں نعمت ہے

تو اب بتاؤ بھائی! جہنم اہل ایمان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہوئی؟ ظاہری بیماریوں کو پاک وصاف کرنے والی ہسپتال کو تو ہم نعمت سمجھتے ہیں؛ لیکن باطنی بیماریوں کو صاف کرنے والی جہنم کو نعمت نہیں سمجھتے، جو ہماری بیماریوں کا علاج کر کے ہمیں جنت میں جانے کے لائق بناتی ہے، یہ بھی اللہ کی نعمت ہی تو ہے؟ اس لیے میں نے کہا کہ جہنم بھی مؤمن کے لیے نعمت ہے۔

ایک حدیث بھی آپ کو سنا دیتا ہوں، جو بڑی عجیب ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ "کافر لوگ جو کہ اہل دوزخ ہیں، وہ جہنم میں نہ تو مریں گے اور نہ زندہ ہی رہیں گے اور رہے وہ لوگ جو اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے یعنی گنہ گار مومن، تو ان کو اللہ تعالیٰ ایک قسم کی موت دے دے گا؛ حتی کہ جب وہ جل کر کوئلہ ہو جائیں گے، تو ان کے حق میں شفاعت کی اجازت دے گا، تو ان کو جماعت در جماعت جنت کی نہروں پر لایا جائے گا اور جنتیوں سے کہا جائے گا

کہ ان پر پانی بہاؤ۔

یہ صحیح حدیث ہے، جس کو امام مسلم رَحِمَہُ اللّٰہُ وغیرہ محدثین نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(مسلم: ۱۸۵، ابن ماجه: ۴۳۰۹، مسند أحمد: ۱۱/۳، مسند ابو يعلىٰ: ۵۱۸/۲، شعب الإيمان: ۲۹۲/۱)

دیکھیے! جہنم کتنی بڑی نعمت ہے کہ ایک بیمار کا علاج کر کے اسے جنت میں جانے کے لائق بناتی ہے اور تکلیف کا احساس نہ ہو، اس کے لیے یہ خدائی انتظام کہ ان گنہ گار مسلمانوں پر ایک قسم کی موت طاری کر دی جاتی ہے، جیسے آپریشن کے وقت ڈاکٹر حضرات مریض کو کلوروفارم (CHOLOROFORM) دے کر بے ہوش کر دیتے ہیں، یہ بھی ایک رحمت وشفقت کی بات ہے؛ اسی طرح اللہ کے یہاں بھی ایسا ہی انتظام ہوگا۔

اللہ اکبر! تو معلوم ہوا کہ جہنم بھی نعمت ہے، جب جہنم ایک نعمت ہے، تو اس سے ایک آیت کی تفسیر بھی سمجھ لیں۔

ایک آیت کی تفسیر

قرآن پاک میں سورۂ رحمٰن میں جگہ جگہ ایک آیت دہرائی گئی ہے: ﴿فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ (اے جنات اور انسانوں کے گروہ! تم اللہ کی کون کونسی نعمتوں کو ٹھکراؤ گے؟)

یہ آیت مختلف قسم کے مضامین کے بعد لائی گئی ہے اور ''سورۂ رحمٰن'' میں بعض جگہ ایسی آیتیں بھی ہیں، جن میں جہنم کے دردناک عذاب کا تذکرہ ہے اور اس کے بعد بھی یہ آیت لائی گئی ہے، مثلاً ارشادِ باری ہے: ﴿یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ

نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلاَ تَنۡتَصِرٰنِ﴾ (آگ کے شعلے اور دھواں تم پر چھوڑا جائے گا، پس تم مدد نہ کیے جاوگے) اس آیت کے متصلاً بعد وہی آیت دہرائی گئی ہے: ﴿فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ (اے جنات اور انسانوں کے گروہ! تم اللہ کی کون کونسی نعمتوں کو ٹھکراؤ گے؟)

اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں عذاب کی دھمکی دی جارہی ہے، وعید سنائی جارہی ہے؛ پھر اس کے بعد نعمتوں کی یاددہانی اور ذکر کا کیا موقعہ ہے؟

ابھی جو مسلم شریف کی حدیث سنائی گئی ہے، اس سے آپ کو جواب آسانی سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ مؤمن کو جہنم میں کوئی خاص تکلیف نہ ہوگی اور اس پر ایک قسم کی موت طاری ہوگی، جب اس کو کوئی تکلیف نہیں؛ بل کہ یہ جہنم مؤمن کے لیے ایک ہسپتال کی طرح ہے، جہاں بیماریاں صاف ہوتی ہیں اور یہ اس کے حق میں یقیناً راحت ونعمت ہے، اس لیے اس موقعے پر نعمتوں کی یاددہانی بے موقعہ نہیں۔

الغرض! جنت تو نعمت ہے ہی اللہ کی، جہنم بھی مؤمن کے حق میں نعمت ہوگی اور ان آیتوں کی اس سے تفسیر بھی ہوگئی۔ یہ نکتہ آج ہی سمجھ میں آیا، اس سے پہلے سمجھ میں نہیں آیا تھا، اللہ نے آپ حضرات کی برکت سے یہ بات فہم میں ڈال دی اور علمِ عظیم عطا فرمادیا۔

”ریاکاری“ دل کی دوسری بیماری

اسی طریقے پر دل کی بیماریوں میں سے ایک بیماری ریاکاری ہے، یعنی اللہ کی اطاعت دوسروں کو دکھانے اور خوش کرنے کے لیے کرنا؛ مثلاً: آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، تلاوت کرتا ہے؛ لیکن ان ساری عبادتوں کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوجائے کہ لوگ مجھے دیکھا کریں اور مجھے واہ واہ کہیں، لوگ میرے سے خوش ہوجائیں،

میری تعریف کریں، یہ نیت دل میں رکھ کر عبادت کرنے کا نام ریا کاری ہے۔

اللہ کی نظر میں اس عبادت کا کوئی اعتبار نہیں، جو غیر اللہ کے لیے کی جائے؛ بل کہ حدیث میں اسے شرکِ خفی کہا گیا ہے۔ایک تو شرکِ جلی ہے، بتوں کی پوجا کرنا، اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کرنا، ذات میں یا صفات میں یا اس کے افعال میں، یہ کھلا ہوا شرک ہے اور ریا کاری شرکِ خفی ہے، کتنی خطرناک بیماری ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شرکِ خفی قرار دیا ہے؛ کیوں کہ یہ دیکھنے میں تو خدا کی عبادت ہے؛ لیکن دل میں غیر اللہ کی خوشنودی مقصود ہے؛ اس لیے یہ شرکِ خفی ہے۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ اگلے، پچھلے تمام بندوں کو جمع کرے گا، تو ایک منادی ندا دے گا کہ جس نے اللہ کی عبادت میں دوسرے کو شرک کیا تھا، وہ انہیں کے پاس جائے جن کو دکھانے کے لیے نیک کام اور عبادت کرتا تھا۔

(ترمذي: ۳۱۵۴،ابن ماجه: ۴۲۰۳ ، مسند أحمد: ۴۶۶/۳،صحيح ابن حبان: ۱۳۰/۲ ، معجم كبير: ۳۰۷/۲۲)

مطلب یہ ہے کہ ریا کاروں سے یہ کہا جائے گا کہ تمہاری عبادت و نیکی کا ثواب بھی ان لوگوں سے لے لو اور طاعت کا صلہ بھی انہیں سے لے لو اور دیکھو کیا دیتے ہیں؟

نیز ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کا حساب و کتاب لیں گے، تو عابد، عالم اور سخی کو اللہ کے دربار میں پیش کیا جائے گا، اور تینوں اپنے اپنے اعمال کا اظہار کریں گے، ارشاد ہوگا کہ یہ سب اعمال تم نے اس لیے کیے ہیں، تاکہ لوگ تمہیں کہیں کہ فلاں شخص مجاہد ہے، فلاں شخص بڑا عالم ہے، فلاں آدمی بڑا سخی ہے اور یہ باتیں تم کو دنیا میں حاصل ہوگئیں، جس مقصد کے لیے نیک اعمال کیے تھے، وہ حاصل ہو چکا؛ لہٰذا اب یہاں کیا چاہتے ہو؟ جاؤ جہنم میں

اوران کوفرشتے اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیں گے۔

(مسلم: ۱۹۰۵، نسائي: ۳۱۳۷، مستدرک: ۱/ ۱۸۹)

معلوم ہوا کہ ریاکاری سے کیا ہوا کام اللہ کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس لیے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے نیت کو خالص اللہ کے لیے کرنا چاہیے۔

’’اخلاص کا فقدان‘‘، دین میں بہت بڑا شگاف ہے

مرتب عرض کرتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت والا کا ایک مدرسہ جانا ہوا، احقر (مرتب) بھی ساتھ تھا، وہاں کے ذمہ داروں نے حضرت والا سے درخواست کی کہ مدرسۂ ھٰذا کے مدرسین کے مابین کچھ اختلافات ہیں؛ اس لیے اساتذہ کو کچھ نصیحت فرمادیں۔ تو حضرت والا نے کچھ قیمتی باتیں ان سے فرمائیں، جس میں اخلاص کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ دین کی خدمت کرنے والوں میں اخلاص کا ہونا بہت ضروری ہے، اخلاص کا فقدان دین کے کاموں میں، مدارس میں، مساجد میں، دینی اداروں میں، بہت بڑا شگاف ہے، جس سے شیطان کا حملہ بہت آسانی کے ساتھ ہوجاتا ہے اور وہ ہمارے ایمان واعمال پر حملے میں کامیاب ہوجاتا ہے، جیسے ’’حضرت ٹیپو سلطان شہید رحمہ اللہ ‘‘ کے واقعات میں لکھا ہے کہ ٹیپو سلطان شہید رحمہ اللہ نے جو ’’سری رنگا پٹنم‘‘ میں انتہائی مضبوط قلعہ بنایا تھا تا کہ دشمن حملہ نہ کر سکے، اسی قلعے میں دشمنِ اسلام ’’انگریز‘‘ ایک شگاف بنا کر قلعے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ہوا یہ کہ ان کے ایک وزیر میر صادق نے حضرت ٹیپو سلطان رحمہ اللہ سے غداری کی اور انگریزوں سے اس نے ساز باز کرلی؛ اسی کے اشارے سے انگریزی فوج نے اس قلعے میں ایک جگہ شگاف ڈال دیا اور اس سے اندر جانے میں کامیاب ہوگئے، یہاں تک کہ اسی کے بعد جنگ میں ٹیپو سلطان شہید رحمہ اللہ

کی شہادت کا روح فرسا اور انتہائی دردناک والم انگیز واقعہ پیش آیا۔

حضرت والا نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ ٹیپو سلطان شہید رَحِمَہُ اللہُ کے قلعے میں شگاف پڑ جانے سے بھی کہیں زیادہ بھاری نقصان دینی خدام میں اخلاص کے نہ ہونے کی وجہ سے جو شگاف پڑتا ہے اس سے ہوتا ہے، جس کی تلافی بھی نہ ہو سکے گی، وہاں تو صرف ٹیپو سلطان رَحِمَہُ اللہُ شہید ہو گئے اور ان کی قلعے کی عمارت منہدم ہو گئی اور حضرت ٹیپو رَحِمَہُ اللہُ کی حکومت ختم ہو گئی تھی؛ لیکن یہاں دین وایمان کی عمارت منہدم ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ دین کا نقصان سب سے بھاری نقصان ہوتا ہے اور اخلاص کے فقدان کا شگاف ایسا خطرناک ہوتا ہے، جس سے بہت سارے فتنوں کو اندر آنے کا موقعہ ملتا ہے، بہت سارے مدارس، ذمہ داروں اور مدرسین میں اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے تباہی وبربادی کا شکار ہو چکے ہیں، بڑے بڑے مدارس میں تالا لگ چکا ہے، وجہ صرف یہ ہے کہ مقصود اللہ کی رضا نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں اختلافات پیدا ہو گئے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدارس بند ہو گئے یا دو ٹکڑے ہو گئے، اس کے برخلاف جن میں اخلاص ہوتا ہے ان کا انداز ہی نرالا ہوتا ہے مخلصین وغیر مخلصین میں بیِّن (واضح) فرق ہوتا ہے اور اللہ کی رضا کے لیے کام کرنے والا ہر کام میں یہ سوچتا ہے کہ میرے کام سے اللہ خوش ہو جائے اور جو یہ سوچ کر کام کرے، وہ کہاں دنیا کے جھگڑوں میں پڑے گا، وہ کہاں اختلاف کرتا پھرے گا۔

پھر فرمایا کہ پانچ باتیں ہیں، جن پر عمل کرنے سے مدارس ترقی کریں گے: (۱) سب سے پہلے تو اخلاص ہو، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں (۲) دوسرے یہ کہ مدرسے میں جو بھی اصول ونظام بنایا جائے اس پر عمل کریں، مثلاً اوقات جو طے کر دیے جائیں، اس کی مکمل پابندی کی جائے، اسی طرح جو ذمہ داریاں متعین کی

جائیں ان کو پورا پورا نبھانے کی کوشش کرے۔ جب تک اصول کی پابندی نہیں ہوگی کوئی کام صحیح نہیں ہوگا۔ (۳) تیسرے یہ کہ مدرسے میں رہنے والوں میں بھائی چارگی ہو، ہر ایک دوسرے کو اپنا بھائی خیال کرے، سب ایک دوسرے کو اپنا معاون سمجھیں اور اسی طرح آپسی معاملہ کریں (۴) چوتھے یہ کہ بچوں کے ساتھ محبت وشفقت کا برتاو کیا جائے؛ کیوں کہ ہم خدامِ مدارس ہی ان کے دراصل باپ وماں اور بھائی، بہن سب کچھ ہیں، ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا جائے، ان کی طبیعت کی فکر کی جائے وغیرہ (۵) پانچویں بات یہ ہے کہ اپنی منزل اور مقصود پر ہمیشہ نظر رہے کہ مجھے کہاں تک پہنچنا ہے۔ جیسے ایک بلڈنگ بنانے والا پہلے متعین کر لیتا ہے کہ مجھے کیسی اور کتنی منزل والی عمارت بنا نا ہے، یا کوئی اور کام کرنے والا اپنا ٹارگیٹ(TARGET) مقرر کرتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ اور مقصود اس کام سے کیا ہے، پھر سب کام وخدمات اسی کے مطابق انجام دیتا رہے۔

''دنیا کی محبت'' دل کی تیسری مہلک بیماری

تیسری چیز: جو دل کی بیماریوں میں سے ایک بڑی بیماری ہے، وہ ہے ''دنیا کی محبت''، دل دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جائے، مال کی محبت، مکان کی محبت، دکان کی محبت، ہر وقت انہی کی فکر میں لگا ہوا ہو اور اللہ کو یاد ہی نہ کرتا ہو، اللہ کی محبت دل میں بسانے کے بہ جائے دنیا کی محبت سمائی ہوئی ہو۔ یہ بھی بڑی خطرناک قسم کی بیماری ہے؛ بل کہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

''حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ''

(دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے)

(شعب الإیمان: ۷/۳۳۸)

اس لیے کہ جب دنیا کی محبت آتی ہے، تو آدمی تمام برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، حلال بھی نہیں دیکھتا، حرام بھی نہیں دیکھتا، اچھا بھی نہیں دیکھتا، برا بھی نہیں دیکھتا، کسی کا کوئی پاس ولحاظ بھی نہیں؛ بل کہ ظلم وزیادتی سے بھی کمائی کر لیتا ہے اور وہ کسی چیز کی تمیز نہیں کرتا، اس لیے کہ دنیا کی محبت نے اسے مجبور کر دیا ہے کہ اس کے لیے ہر قسم کا کام کر کے اس کو حاصل کرے۔

ایک دل میں خدا اور دنیا کی محبت جمع نہیں ہو سکتی

میرے بھائیو! یاد رکھو کہ دنیا کی محبت جس کے دل میں ہو، اللہ کی محبت کبھی اس کے دل میں نہیں آسکتی۔ حدیث میں آتا ہے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "مَنْ أَحَبَّ دُنْيَاهُ أَضَرَّ بِآخِرَتِهِ وَ مَنْ أَحَبَّ آخِرَتَهُ أَضَرَّ بِدُنْيَاهُ، فَآثِرُوْا مَا يَبْقٰى عَلٰى مَا يَفْنٰى" (جس نے اپنی دنیا سے جی لگا لیا، اس نے اپنی آخرت کا نقصان کیا اور جس نے اپنی آخرت سے جی لگا لیا، اس نے اپنی دنیا کا نقصان کیا؛ لہٰذا تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دو)

(مسند أحمد: ۴/۴۱۲، مستدرک: ۴/۳۴۳، شعب الإیمان: ۷/۲۸۸)

علما کہتے ہیں کہ دنیا اور آخرت یہ دونوں ایسے ہیں جیسے دو سوکنیں ہوتی ہیں، اور دو سوکنیں ایک جگہ کبھی خوشی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں؟ کبھی نہیں ہو سکتیں، دونوں کے اندر ہمیشہ جھگڑا رہے گا، اس کو خوش کرو، تو یہ ناراض اور دوسری کو خوش کرو، تو پہلی ناراض، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اسی طریقے پر دنیا کو پانا چاہو گے، تو آخرت تم سے چھوٹ جائے گی اور آخرت کو حاصل کرو گے، تو ضرور دنیا تم سے دور ہو جائے گی، لہٰذا اگر خدا کو ناراض کرو گے، تو دنیا مل سکتی ہے، دنیا کو ناراض کرو تو، پھر اللہ مل سکتا ہے؛ لیکن یہ کہ بیک وقت دونوں کو راضی کر کے رکھیں، اللہ کے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت کو دل سے نکالنے کی ضرورت ہے، تاکہ اللہ کی محبت ہمارے اندر آئے۔

دنیا کی محبت کا نشہ شراب کے نشے سے بڑھا ہوا ہے

فرمایا کہ آدمی جب شراب پی لیتا ہے، تو اسے نشہ آتا ہے اور جب نشہ آتا ہے، تو اس کے نتیجے میں وہ بہت سارے برے کام کر بیٹھتا ہے، یعنی شراب پینا ایک ایسا خبیث کام ہے، جس کی وجہ سے بہت سارے خبائث وجود میں آتے ہیں، جیسے ایک واقعہ ہے کہ ایک آدمی کو مجبور کیا گیا کہ تین چیزوں میں سے ایک کو اختیار کرے، یا زنا کرلے، یا ایک آدمی کو قتل کردے، یا شراب پی لے، تو اس نے سوچا کہ زنا اور قتل تو بڑے گناہ ہیں، اس لیے چلو شراب پی لیتے ہیں، تو اس نے شراب پی لی، جب شراب پیا تو نشے میں زنا بھی کرلیا اور قتل بھی کر بیٹھا، تو اس طرح شراب دیگر گناہوں کے لیے دروازہ بنتا ہے؛ لیکن میں کہتا ہوں کہ شراب کے نشے سے بھی زیادہ دنیا کی محبت کا نشہ ہے کہ جس پر اس کا نشہ سوار ہوجاتا ہے، وہ نہ حلال کی تمیز کرتا ہے، نہ حرام کی تمیز کرتا ہے اور نہ اپنے کو دیکھتا ہے نہ پرائے کو دیکھتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر سے نیچے تک ہمارے بادشاہوں میں چند کو مستثنیٰ کرکے اکثر میں عیاشی تھی، قتل وقتال ان کا مشغلہ بن گیا تھا، ظلم و زیادتی ان کی عادت بن گئی تھی، روزانہ بے گناہوں کا قتل ہورہا ہے، ناانصافیوں کا ایک طویل وعریض سلسلہ ہے، حق و باطل میں کوئی تمیز قائم نہیں ہے؛ بل کہ باپ بیٹے کو یا بیٹا باپ کو قتل کرارہا ہے۔

حجاج بن یوسف کے بارے میں لکھا ہے کہ جب تک روزانہ کم از کم ایک قتل کا

حکم صادر نہیں کر دیتا تھا، اسے چین نہیں آتا تھا، بے شمار علما و صلحا؛ بل کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس نے قتل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بھی اسی نے قتل کیا تھا اور ان کا سر نکال کر کعبے پر لٹکا دیا تھا۔ تاریخ ایسے بادشاہوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے، اسی طرح اسلامی تاریخ میں غداروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی، جن کے مکر و سازش کی وجہ سے اسلام کو اور ملک کو بڑا نقصان ہوا ہے۔

اس کے اسباب پر جب آپ غور کریں گے، تو اکثر واقعات میں دنیا کی محبت ہی سامنے آئے گی؛ اس لیے کہ جس کے دل میں دنیا کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، اسے اندھا، بہرا بنا دیتی ہے، جس کی وجہ سے تمام برائیاں وجود میں آتی ہیں۔

ایک عبرت خیز حدیث

یہیں سے وہ حدیث بھی سمجھ میں آجاتی ہے، جس کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلاَ فِي الْغَنَمِ بِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَ الشَّرَفِ لِدِيْنِهٖ" (دو بھوکے بھیڑئے، جن کو بکریوں میں چھوڑ دیا گیا ہو، وہ اس قدر ان بکریوں کو نقصان نہیں دیتے جتنا کہ آدمی کے اندر مال وجاہ کی حرص اس کے دین کو نقصان دیتے ہیں) (ترمذي: ٢٣٧٦، مسند أحمد: ٤٥٦/٣، دارمي: ٣٩٤/٢، صحيح ابن حبان: ٢٤/٨)

اللہ اکبر! دنیا کی محبت و حرص اس قدر نقصان دہ ہے دین کے لیے کہ بھوکے بھیڑیے بھی بکریوں کے ریوڑ کو اس قدر نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ظاہر ہے کہ یہ مختلف قسم اور مختلف انداز کے دینی نقصانات ہیں، جو محبتِ دنیا کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

دنیا کا استعمال ضرورت کے لیے ہو

لیکن یہاں ایک بات یاد رکھیں، وہ یہ کہ ایک ہے دنیا کا ضرورت کے لیے استعمال اور ایک ہے دنیا کی محبت میں گرفتار ہونا؛ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک یہ ہے کہ آدمی ضرورت کے لیے دنیا کو استعمال کرتا ہے، کھانے کے لیے، پینے کے لیے، پہننے اور رہنے کے لیے، ان چیزوں کے لیے دنیا کو ضرورت کی خاطر استعمال کرتا ہے اور پھر اللہ کے حکم کے ماتحت استعمال کرتا ہے، تو اس کا نام دنیا نہیں ہے، یہ دنیا کی محبت نہیں ہے، یہ دنیا کا استعمال ہے، اللہ نے دنیا اسی لیے تو دی ہے کہ ضرورت میں اس کو استعمال کرو۔

دیکھیے! قرآن میں اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ﴾ (اے نبی! ذرا پوچھیے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی زینت کو، جس کو اللہ نے اپنے خاص بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور رزق میں سے عمدہ چیزیں) [الأعراف: ۳۲]

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ "اَخرج لعبادہٖ" یعنی دنیا کی زینت کو اللہ نے اپنے خاص بندوں ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ نے کافروں کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؛ لہٰذا نیک بندوں کے علاوہ جو لوگ دنیا کو استعمال کرتے ہیں، وہ دراصل غاصب ہیں، غصب کر کے اس کو استعمال میں لاتے ہیں، یہ نیک بندے اسے ضرورتاً استعمال کرتے ہیں اور دوسرے لوگ اسے دل سے لگا لیتے ہیں اور یہی دل سے لگانا غلط ہے اور ضرورت کے لیے استعمال کر لینا جائز ہے، جیسے ہم استنجا کے لیے ڈھیلے لیتے ہیں، یہ ایک ضرورت ہے؛ لہٰذا یہ جائز ہے؛ لیکن اگر کوئی ان ڈھیلوں کو مقصودِ زندگی بنا لے اور ہر وقت اسی کی دھن و فکر میں لگا رہے، تو یہ غلط بھی

ہے اور بے وقوفی کی حرکت بھی۔

اسی لیے ساری دنیا کو ملعون قرار دیا گیا ہے، سوائے اس کے کہ اس دنیا کو دین کے لیے اختیار کیا جائے۔ ایک حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ''اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَمَلْعُوْنٌ مَا فِیْھَا إِلَّا ذِکْرُاللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ وَعَالِمٌ وَمُتعلم'' (دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے، وہ بھی ملعون ہے، سوائے اللہ کے ذکر کے اور اس کے، جو اللہ کے ذکر سے تعلق رکھنے والی ہو اور عالم اور طالب علم کے۔ (ترمذي: ۲۳۲۲)

جو اللہ والا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے دل میں یہ ملعون چیز کیوں رہے؟ چاہے وہ جائز ہی کیوں نہ ہو اور ذکر اللہ سے تعلق رکھنے والی چیزیں جیسے قرآن ہے حدیث ہے، علومِ شرعیہ ہیں، مدارس ہیں، مساجد ہیں، مساجد سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں، علما ہیں، طلبہ ہیں اور دینی خدام ہیں، یہ سب اس لعنت سے محفوظ ہیں۔

الغرض اپنی دینی و دنیوی ضرورتوں میں تو دنیا کا استعمال درست ہے؛ لیکن اسی کو مقصود بنا لینا جائز نہیں، قابلِ ملامت کام ہے اور انسان کو لے ڈوبتا ہے۔

دنیا کی مثال

یاد رکھو! کہ دنیا کو مقصود بنانے کے لیے نہیں، اس سے محبت کرنے کے لیے نہیں؛ بل کہ ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بنایا گیا اور ہمیں دیا گیا ہے، کیوں کہ دنیا کے بغیر بھی تو ہم جی نہیں سکتے، نماز، روزہ بھی نہیں کر سکتے، نیک کاموں میں خرچ کرنا چاہیں، تو اس کے لیے بھی ہمیں دنیا کی ضرورت ہے؛ لہٰذا دنیا تو ضرورت ہے، ہاں! دنیا کی محبت خطرہ ہے۔

مثنوی شریف میں مولانا رومی رحمہ اللہ نے اس کی ایک مثال دی ہے،

فرمایا: جیسے کشتی ہوتی ہے کہ کشتی بغیر پانی کے کبھی چل نہیں سکتی، نیچے پانی ہونا ضروری ہے؛ لیکن وہ پانی جو کشتی چلانے کے لیے ضروری ہے، اگر وہ کشتی کے اندر آجائے، تو کشتی کو ڈبو کر رکھ دے گا۔ فرمایا کہ اسی طریقے پر آپ کے دین کی کشتی کو چلانے کے لیے دنیا ضروری ہے، مثلاً: آپ زکوۃ کیسے ادا کریں گے؟ مال ہے، تبھی تو ہے زکوٰۃ، اسی طرح نماز پڑھنے کے لیے کپڑوں کی ضرورت ہے، نماز پڑھنے کے لیے مسجد کی ضرورت ہے، مسجد بنانے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے، پیسے نہیں ہوں گے، تو یہ سب چیزیں کیسے بنائیں گے؟ دین کی حفاظت واشاعت کے لیے مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت ہے، غریبوں یتیموں کی امداد کیسے کریں گے؟ اس کے لیے بھی مال کی ضرورت ہے، تو دیکھیے! دنیا کا ہونا دین کی کشتی کو چلانے کے لیے ضروری ہوا کہ نہیں؟ لیکن جب تک یہ مال پیسہ باہر باہر رہے گا، یہ دنیا ہاتھوں میں رہے گی، اس وقت تک دین کی یہ کشتی چلتی رہے گی اور جس دن یہ مال کی محبت دل میں گھس جائے گی، تو انسان کو اسی طرح ہلاک کر دے گی جیسے پانی کشتی میں داخل ہو کر کشتی والوں کو ڈبو کر ہلاک کر دیتا ہے، اس لیے اسے دل میں مت جماؤ، یہ بہت خطرناک چیز ہے۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ دنیا کو ایسا سمجھو جیسے استنجا کے ڈھیلے، کہ بڑے ضروری ہوتے ہیں، اسے ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے؛ لیکن اگر کوئی صاحب ان ڈھیلوں کو جمع کر کر کے الماری میں رکھا کریں، صندوق میں رکھا کریں، تو آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کہیں گے کہ اسے مینٹل (MENTAL) (دماغی) ہسپتال میں داخل کرنا چاہیے، کیوں کہ ایک غیر ضروری چیز کو ضروری سمجھ کر استعمال کرنا بے وقوفی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک غیر ضروری چیز کو ضروری چیز جیسا درجہ دیا جائے، تو اس کا نام ہے پاگل پن۔

اس مثال کوسامنے رکھ کرہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا کے معاملے میں ہم نے اگر یہ کام کیا،تو ہم بھی پاگل ہیں،خدا کی نظر میں اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نظر میں ان چیزوں کی حیثیت ان ڈھیلوں جیسی ہے۔

دنیا کی حقیقت-اکبرالٰہ آبادی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا واقعہ

اکبرالٰہ آبادی کا ایک واقعہ یادآ گیا کہ وہ ہندوستانی عدالت کے جسٹس (JUSTICE) تھے، ایک دفعہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ، جو بہت پڑھے لکھے لوگ تھے، کسی خاص مسئلے پر ایک کمرے میں بیٹھے گفتگو کررہے تھے، اتنے میں ان کے والد جو بوڑھے تھے، وہ کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے ہاتھ میں ایک بیلون (BALOON) تھا، (جسے غبارہ کہتے ہیں، بچے ان میں پھونک مارتے اور ان سے کھیلتے اور ان کو پھوڑتے ہیں) وہ اندر آئے اور کہنے لگے بیٹا اکبر! یہ دیکھو تمہارے لیے کیا لایا ہوں؟ تم بچپن میں اسے بہت پسند کرتے تھے، اور رُو رُو کر اسے مانگا کرتے تھے؛ لہٰذا یہ غبارہ تمہارے لیے لایا ہوں۔

بس جناب یہ سننا تھا کہ اکبرالٰہ آبادی کے اوپر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا، نہایت شرمندہ ہوگئے کہ ایک چیف جسٹس (CHIEF JUSTICE) اور ان کے ساتھ بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں، ان کے سامنے والد صاحب غبارہ لا کر دے رہے ہیں کھیلنے کے لیے، کتنی شرم کی بات ہے، وہ بہت ہی شرمندہ ہوگئے۔ اکبرالٰہ آبادی کے چہرے پر شرمندگی کے آثار جو نمایاں تھے، اسے دیکھ کر ان کے والد نے کہا کہ بیٹا! مجھے احساس ہے کہ غبارے کے دیکھنے سے اس وقت تمہیں شرمندگی محسوس ہو رہی ہے؛ لیکن میں تم کو اور تمہارے ان ساتھیوں کو ایک بات سمجھانے کے لیے آیا ہوں؛ وہ یہ کہ تم جو آج ان عہدوں اور دولت کی چیزوں

پر فخر کرر ہے ہو اور ان کو حاصل کرنے کی فکر کرتے ہو، کل قیامت کے دن وہی چیز تم کو دی جائے گی، تو وہاں بھی تم کو اسی طرح شرم آئے گی، جیسے آج تمہارے بچپن کی خواہشات ومطالبات پر شرم آرہی ہے۔

اللہ اکبر! کتنا بڑا سبق پڑھا دیا اس معمولی سے واقعے سے !!! یہ بلڈنگ آج ہمیں اچھی لگتی ہیں، دنیا کا پیسہ بہت اچھا لگتا ہے؛ بل کہ آدمی اسے دوسروں سے چھیننا چاہتا ہے، اس کو جمع کرنا چاہتا ہے، اس کو بڑھانا چاہتا ہے، بڑی فکریں اس کے لیے کرتا ہے، اپنی نیند قربان کرتا ہے، اپنی جان قربان کرتا ہے ؛لیکن اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جب انسان کو یہ دولت دیں گے، تو اسے وہاں شرم آئے گی ، اس لیے کہ وہاں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوگی۔

زمین اپنے خزانے اُگل ڈالے گی

آخرت میں کیا، دنیا ہی میں ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ زمین اپنے خزانے اُگل ڈالے گی ؛مگر اسے کوئی لینے والا نہیں ہوگا۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ”زمین اپنے جگر کے ٹکڑے یعنی سونا وچاندی کے خزانے اُگل ڈالے گی، اس واقعے سے پہلے ایسا ہوا ہوگا کہ اسی مال کی خاطر ایک بھائی نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا ہوگا، کسی نے اسی کے لیے اپنے رشتے ، ناتے توڑے ہوں گے، کسی نے اس کی خاطر چوری کی ہوگی اور اس کے ہاتھ کاٹے گئے ہوں گے؛ اب لوگ اس مال کو لات مارتے ہوئے جائیں گے، کوئی اس کو اٹھانے والا نہیں ہوگا، تو وہ قاتل کہے گا کہ ”فِيْ هٰذا قَتَلْتُ؟“ (اسی کے لیے میں نے قتل کیا تھا) اور رشتے توڑنے ولا آئے گا اور کہے گا ”فِيْ هٰذا قَطَعْتُ؟“ (اسی کی خاطر میں نے رشتہ توڑا تھا؟) اور چور آئے گا اور

کہے گا "فِيْ هٰذا قُطِعَتْ يَدِي" (اسی کی وجہ سے میرے ہاتھ کاٹے گئے؟) مگر یہ لوگ اس میں سے کوئی چیز نہیں لیں گے)

(مسلم:١٠١٣،ترمذي:٢٢٠٨،صحيح ابن حبان:١٥/٩٠،مسند أبويعلىٰ:١١/٣٢)

قرآن میں بھی اس کا ذکر موجود ہے:﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا﴾ [الزلزال: ١-٢] (جب زمین کو زلزلہ آئے گا اور زمین اپنے خزانے اُگل ڈالے گی)

اس میں قیامت کے زلزلے کا ذکر ہے اور اس وقت زمین کے خزانے اُگلنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور حدیث میں اس سے بھی پہلے ہونے والے واقعے کا ذکر ہے۔

دنیا کی حقیقت پر ایک عجیب قطعہ

حیدرآباد میں ایک شاعر "امجد حیدآبادی" گزرے ہیں، ان کے اشعار بہت پُرمغز وحقیقت نما ہوتے ہیں، دنیا کی حقیقت پر ان کا قطعہ یاد آ گیا

دنیاوالو! ثبات دنیا میں نہیں ☆ یک لحظہ قرارِ موج دریا میں نہیں

عالم کا وجود صورتِ "لا" سمجھو ☆ لفظاً موجود، معنے میں نہیں

یعنی یہ کہتے ہیں کہ جیسے دریا میں ہر وقت تحریک رہتی ہے، اِدھر سے اُدھر وہ موجیں مارتا رہتا ہے، اسی طرح پوری دنیا میں یہی حال ہے، کسی چیز کو قرار نہیں، کوئی مر رہا ہے، کوئی جی رہا ہے، اِدھر دیکھو، تو خوشیاں ہیں، اُدھر دیکھو تو غمیاں ہیں، کوئی صحت مند ہو رہا ہے، کوئی مریض ہو رہا ہے، کوئی مال دار ہو رہا ہے، کوئی غریب ہو رہا ہے۔ یہ ہے دنیا کا نقشہ؛ پھر شاعر نے اس بے ثباتی سے اس کی بے حقیقتی پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ دیکھو "لا" لکھتے اور بولتے ہیں، لا کے معنی ہیں

''نہیں''، جیسے کہتے ہیں ''لا إلٰه'' (نہیں ہے کوئی معبود) یہ ''لا'' لفظاً تو موجود ہے، لکھا جاتا ہے، بولا جاتا ہے، پڑھا جاتا ہے، پڑھایا جاتا ہے؛ لیکن اس کے معنے ہیں ''نہیں''، یہ صورت میں تو موجود ہے معنے میں نہیں، اسی طرح یہ پورا عالم دیکھنے میں تو ہے، معنی میں کیا ہے؟ کچھ نہیں!۔ کیا عجیب مثال دی، دیکھنے میں سورج بھی نظر آرہا ہے، چاند بھی نظر آرہا ہے، بظاہر سب کچھ موجود ہے، حقیقت میں کچھ نہیں۔

الغرض! دنیا کی بے حقیقتی و بے ثباتی سے عبرت لیتے ہوئے انسان کو چاہیے کہ وہ اس سے کنارہ کش ہو اور اس کے پیچھے نہ پڑے اور ہر وقت اسی کی دُھن وفکر میں نہ رہے اور اسی کے لیے جینے اور مرنے کا نظریہ چھوڑ دے۔

طہارت کی چوتھی قسم

اب لیجیے! چوتھی قسم کی طہارت کو، یہ طہارت بڑی عجیب وغریب ہے، کمال درجے کی طہارت ہے اور اس کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، سب سے اونچا درجہ ہے، اور یہ مخصوص بندوں اور اللہ کے مقرب بندوں کا حصہ ہے، اللہ کسی پر فضل کرے، تو اس کو وہ دولت مل سکتی ہے، حضراتِ انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو اور پھر اس کے بعد انہیں کی تبعیت اور انہیں کی وراثت اور طفیل میں اولیا اللہ کو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔

یہ عظیم الشان طہارت کیا ہے؟ وہ ہے ''اپنے دل کو اللہ کے ماسوا تمام چیزوں سے خالی اور پاک کر لینا''، اس لیے کہ جو کچھ دنیا کی چیزیں ہم کو نظر آتی ہیں، یہ حقیقت میں گندگی ہیں، اللہ پاک ہے اور اللہ کی پاکی کے سامنے دنیا کی ہر چیز بالکل ناپاک ہے؛ اس لیے دنیا کی ان تمام چیزوں سے اپنے دل کو پاک وصاف کر کے اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت کو سما لینا، اللہ کے عشق کو بسا لینا، دل میں کچھ نہ رہے، صرف اللہ رہے اور ساری چیزیں نکل جائیں؛ یہ سب سے اعلیٰ درجے کی پاکی و

طہات ہے۔

اب جو اچھی چیزیں ہیں، جو جائز چیزیں ہیں، وہ بھی اس کے دل میں نہیں رہیں گی، دنیا کی کوئی خواہش، دنیا کی کوئی تمنا، دنیا کی کوئی آرزو، دنیا کی جائز خواہشیں سب اس سے نکل جائیں گی، صرف دل میں اللہ ہی اللہ رہے گا۔

خواجہ مجذوبؔ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کا ایک شعر

حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؔ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنے ایک شعر میں طہارت کے اسی مقام کا ذکر کیا ہے کہ ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی ☆ اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

خواجہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس میں اللہ سے خطاب کیا ہے کہ اے میرے مالک! اب دل میں کوئی تمنا نہیں ہے، کوئی خواہش نہیں ہے، کوئی آرزو نہیں ہے، اب دل خالی ہو چکا ہے، خلوت کے معنے ہیں سب چیزوں سے دل خالی ہوگیا، حرص سے، ہوس سے دل خالی ہوگیا؛ لہٰذا اب یہ دل تیرے قابل بنا چکا ہوں، اب اس میں صرف تیری ہی جلوہ نمائی ہوسکتی ہے، ”اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی“۔

ہمارے حضرت مسیح الامت رَحِمَہُ اللّٰہُ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نے تمام اعضا دو، دو دیے ہیں، دو ہاتھ ہیں، دو پیر ہیں، دو آنکھ ہیں؛ لیکن بھائی اللہ نے دل ایک دیا ہے اور زبان ایک دی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس ایک دل کے اندر صرف میری گنجائش ہونی چاہیے اور کسی کی نہیں اور اس زبان میں صرف میرا ذکر ہو اور کسی کا نہیں، زبان میں میرا ذکر ہو، دل میں میری یاد ہو۔

”مقصدِ تخلیق“ معرفت ومحبتِ حق سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی ہے

کیوں کہ ہماری تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اللہ کی معرفت ومحبت اپنے اندر

پیدا کریں ،ایک حدیثِ قدسی میں آیا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:''کُنتُ کَنزاً مَخفِیّاً فَأَحبَبتُ أَنْ أُعرَفَ فَخَلَقتُ الْخَلقَ''(میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میری معرفت ہو، میری پہچان ہو،تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا)

یہ حدیث محدثین کے نزدیک لفظاً ثابت نہیں ہے؛ لیکن وہ حضرات کہتے ہیں کہ اس کا معنی ومفہوم دیگر احادیث ودلائل سے ثابت ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو جاننے والا نہیں تھا، نہ یہ آسمان موجود تھا، نہ یہ زمین موجود تھی ، نہ یہ ستارے موجود تھے، نہ یہ انسان موجود تھا، سب کی سب چیزیں معدوم تھیں، کوئی چیز موجود نہیں تھی ،صرف اللہ کی ذات موجود تھی ، اس مخلوق کو پیدا کر کے اللہ نے کیا چاہا؟ اللہ کو پہچانو، اللہ سے محبت کرو، اللہ میں غور کرو، یہ جتنی مخلوقات ہیں ان کو دیکھ کر مخلوق کو نہیں ؛ بل کہ دراصل خالق کو پہچانو، مخلوقات تو ذرائع ہیں ، وسائل ہیں، اسباب ہیں ؛ لیکن ان سب چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے، زمین کو دیکھ کر، آسمان کو دیکھ کر، سورج کو دیکھ کر، چاند کو دیکھ کر، انسان کو دیکھ کر، انسان کے اندر کی چیزوں کو دیکھ کر، اس کے اندر کی خصوصیات وکمالات کو دیکھ کر، ان سب چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے قلب کے اندر پیدا کرنا مقصود ہے۔

اس کے لیے اللہ نے اس کائنات کو اور اس کے ذرے ذرے کو پیدا کیا، معلوم ہوا کہ انسان کو پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے، اللہ سے محبت کرے، اس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے؛ لیکن انسان دنیا میں آنے کے بعد دنیا کی حقیر اور فانی چیزوں سے دل لگا لیتا ہے اور انہیں کو اپنا مقصود

وقبلہ سمجھتا ہے۔ تو بھائیو! بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دل کو پاک وصاف کرنے کے بعد مقصود یہ ہے کہ اس دل کے اندر خدا کی محبت سمائی اور بسائی جائے۔

چاروں طہارتیں مل کر آدھا ایمان کیوں ہیں؟

الغرض! اسلام میں طہارت وپاکی کا جو تصور ہے، وہ ان سب امور واقسام کے لحاظ کے ساتھ میں ہے، جب ہم اس کو اس طرح سمجھیں گے، تو اس حدیث پر کوئی اشکال واعتراض نہیں ہوگا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے صرف طہارت کو کیسے آدھا ایمان قرار دے دیا؟ ظاہر ہے کہ جب اس تفصیل کے ساتھ طہارت کو سمجھا جائے گا اور اس کی ان قسموں کو ملحوظ رکھا جائے گا، تو کیا اشکال کی گنجائش ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ یہ چاروں طہارتیں مل کر آدھا ایمان کیوں ہیں؟ میرے ذہن میں اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لیے دو چیزیں چاہئیں: ایک اوامر یعنی جن چیزوں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے نماز ہے، روزہ ہے، حج ہے، قربانی ہے، زکوٰۃ ہے وغیرہ، ان کی بجا آوری وتعمیل اور ایک نواہی یعنی جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، ان سے دوری وپرہیز، اب غور کریں کہ پاکی وطہارت میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں، جن سے پرہیز کا حکم ہے اور وہ تمام قسم کی برائیاں ہیں، ظاہری بھی اور باطنی بھی؛ لہٰذا تمام حرام وناجائز اور بُری باتوں سے بچنا ہی پاکی وطہارت ہے، تو یہ آدھا ایمان ہوگیا اور باقی آدھا ایمان اوامر ونیکیوں کی بجا آوری میں ہے، اس طرح طہارت آدھا ایمان قرار پاتا ہے۔

تو مامورات کو پورا کرنا آدھا ایمان اور ممنوعات سے بچنا آدھا ایمان، دونوں کو ملائیں تو مکمل ایمان ہوگیا۔

پہلے تخلیہ؛ پھر تحلیہ

اب ایک اور نکتہ سنیے! وہ یہ کہ اسلام میں پاکی کو تمام عبادات پر مقدم رکھا گیا ہے، ظاہری پاکی بھی مقدم ہے اس کے بعد نماز و عبادت ہے، اگر کوئی بے وقوف پہلے نماز پڑھ لے اور بعد میں پاکی حاصل کرے، تو یہ غلط اور حماقت ہے، اسی طرح نیکیاں وخوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے سے پہلے اپنے اندر سے برائیوں اور ظاہری وباطنی گندگیوں کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پہلے یہ فرما کر کہ طہارت آدھا ایمان ہے، ہمیں پہلے ممنوعات وگناہوں سے بچنے کا حکم دے دیا، اس لیے کہ جب انسان کسی جگہ پر بلڈنگ بنانا چاہتا ہے، تو سب سے پہلے وہاں کے جھاڑ، جھنکاڑ پاک وصاف کرتا ہے، گندگی ہو، تو اسے ہٹاتا ہے، زمین ہموار کرتا ہے؛ پھر اس کے بعد وہاں تعمیر کرتا ہے۔ اسی طرح ایمان کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے گناہوں اور نواہی کے جھاڑ، جھنکاڑ اور گندگی وآلودگی کو پہلے صاف کرنا پڑے گا، جب دل کی جگہ پاک وصاف ہوجائے گی، تو پھر ایمان کی عمارت تعمیر ہوگی، پھر نماز کے ذریعے، ذکر کے ذریعے، تلاوت کے ذریعے، دیگر عبادات کے ذریعے ایمان کی عمارت تعمیر ہوگی، اگر پاکی وصفائی کے بغیر عمارت تعمیر کردی گئی، تو عمارت تو بن جائے گی؛ لیکن اس کے اندر نقص وکھوٹ رہ جائے گا۔

اسی کو حضراتِ صوفیائے کرام ”تخلیہ وتحلیہ“ سے تعبیر کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پہلے تخلیہ یعنی صفائی و پاکی ہوگی، اس کے بعد پھر تحلیہ یعنی اس کو آراستہ، پیراستہ کیا جائے گا اور سنوارا جائے گا۔

چوتھا درجہ بطورِ انعام دیا جاتا ہے

میرے بھائیو! جب بندہ پاکی سے پہلے تین درجات کو حاصل کرنے کی کوشش

کرتا ہے اور اس کے اندر اسے کامیابی مل جاتی ہے، تو چوتھا درجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ انعام دیا جاتا ہے۔

جیسے بچہ تعلیم میں محنت کرتا ہے، تو اس سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے اتنی محنت کی، تو تم پاس ہو جاؤ گے؛ لیکن بچہ جب پاس ہو جاتا ہے، تو اسے انعام دیا جاتا ہے۔ پاس ہونا تو اس کی محنت کا نتیجہ ہے، انعام کا دیا جانا دراصل استاذوں کی طرف سے بطورِ تحفہ اور عنایت کے ہوتا ہے۔ اسی طریقے پر جب بندہ اپنے ظاہر و باطن کی صفائی کے لیے محنت کرتا ہے، کوشش کرتا ہے، تو یہ تین درجے اس کی محنت کے نتیجے میں اس کو دیے جاتے ہیں اور کامیابی کا راستہ اس کے لیے کھول دیا جاتا ہے اور چوتھا درجہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے، اپنے کرم سے، اپنے احسان سے عطا فرماتے ہیں۔

لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ ان تین درجات کی تحصیل کے لیے خوب کوشش کرے، اتنی کوشش، لگن اور محنت ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے چوتھی چیز بطورِ عنایت اور بطورِ تحفہ اس کو دے دی جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محض اپنے فضل و کرم سے تمام قسم کی پاکیوں اور طہارتوں سے مالا مال فرمائے اور اپنی رحمت و مغفرت کا حصہ عطا فرما دے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین

محبتِ الٰہیہ
اور اس کے
آثار ولوازم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبتِ الٰہیہ اور اس کے آثار ولوازم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین ،
أما بعد: فأعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم :

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾

تمام عرفانی مقامات میں سب سے بلند وعظیم مقام ’’محبتِ الٰہیہ‘‘ کا ہے، اس کے اول وآخر جو کچھ ہے، وہ یا تو اس کا مقدمہ ہے یا نتیجہ وثمرہ ہے۔ جیسے: توبہ، صبر اور زہد، توکل وغیرہ مقامات ’’محبتِ الٰہیہ‘‘ کا مقدمہ ہیں کہ اس کی تحصیل ان پر موقوف ہے۔ اور شوق، اُنس، رضا وغیرہ مقاماتِ عرفانی اسی محبتِ الٰہیہ کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں کہ جس کسی کو بھی محبتِ الٰہیہ کا ادراک ہوگا، وہ ضرور ان مقامات کو بھی حاصل کرے گا۔

غرض یہ کہ ’’محبتِ الٰہیہ‘‘ وہ بلندترین وعظیم الشان روحانی وعرفانی مقام ہے کہ اس سے بلند وعظیم کوئی مقام نہیں اور معرفتِ الٰہیہ جو کہ مقصدِ تخلیقِ انسان ہے، اس کے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہی محبوبِ حقیقی ہے

غرض یہ کہ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ سے محبت لازم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارا محبوبِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جو دنیوی محبتیں ہیں، وہ محض فانی ہیں اور مجازی ہیں؛ کیوں کہ جن جن خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے انسان دوسرے انسانوں سے اور چیزوں سے محبت کرتا ہے وہ ساری خوبیاں اور کمالات ان انسانوں اور

چیزوں میں ان کے ذاتی اور خانہ ساز نہیں ؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے ہیں؛ پھر یہ ساری دنیوی خوبیاں اور کمالات فنا کے گھاٹ اتر جانے والے ہیں، اس لیے ان سے کیا محبت کی جاسکتی ہے۔

ہاں! حقیقی معنے میں محبت تو صرف اللہ تعالیٰ سے ہوسکتی ہے، یا ان ہستیوں سے جن کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو۔ جیسے انبیا علیہم السلام و اولیائے کرام اور علمائے عظام رحمہم اللہ، جن کے ذریعے ہمیں اللہ کی معرفت و محبت نصیب ہوتی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے سارے کمالات اس کے اپنے ذاتی ہیں اور وہ ان کمالات سے ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا۔

کائنات فانی ہے- حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کا واقعہ

اور دنیا کی چیزوں کو اس لیے بھی دل سے نکالنا ہے کہ ان کے اندر اگر کوئی عیب نہیں ہے، تو ایک عیب ضرور ہے، وہ یہ ہے کہ وہ فانی ہیں۔ چلیے مان لیا کہ سورج ماشاء اللہ بہت بہترین ہے اور نہایت حیرت انگیز ہے؛ لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود بھی فانی ہے، ختم ہو جانے والا ہے، ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ عَلَیْہِ السَّلَام نے لوگوں کی اصلاح کے لیے ایک دفعہ ایسا کیا کہ آپ باہر تشریف لائے اور اس وقت آسمان پر ستارے نکلے ہوئے تھے، اوپر دیکھا ستاروں کی طرف کہ ماشاء اللہ ٹمٹمار ہے ہیں، (دیکھنے میں تو ٹمٹمار ہے ہیں؛ لیکن حقیقت میں یہ بہت بڑے بڑے ہیں، بہت دوری پر ہونے کی وجہ سے وہ ہمیں ایسے نظر آتے ہیں گویا ٹمٹمار ہے ہیں) تو حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے ان کو دیکھ کر کہا ﴿هٰذَا رَبِّیْ﴾ کہ یہ میرا رب ہے، یہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے کہا تھا، ایسا نہیں کہ وہ نعوذ باللہ ان کو رب مان رہے تھے، نبی

تو کوئی گناہ بھی نہیں کرسکتا، شرک کیسے کرسکتا ہے؟ کیوں کہ جمہور علما کا مذہب ہے کہ انبیا قبل از نبوت اور بعد از نبوت معصوم ہوتے ہیں۔

خیر کچھ دیر کے بعد جب ستارے چھپنے لگے، غائب ہونے لگے، تو ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے لوگوں کی عقلوں کے مطابق ان کو سمجھانے کے لیے فرمایا:

﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ﴾ کہ یہ ختم ہوجانے والوں، غروب ہوجانے والوں، غائب ہوجانے والوں کو میں پسند نہیں کرتا، ان کو خدا کیسے بنالوں؟ خدا تو وہ ہوتا ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتا دنیا کو اور دنیا کی ان چیزوں کو ثبات کہاں ہے؟ ثبات تو صرف اللہ کو ہے۔

پھر کسی موقعے پر حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام باہر نکلے، تو دیکھا کہ چاند نکلا ہوا ہے، بہت خوب اس کی روشنی پھیلی ہوئی ہے، کہنے لگے ''ہٰذا رَبِّیْ'' کہ یہ میرا رب ہے، ارے! وہ ستارے تو خدا نہیں ہوسکتے تھے؛ کیوں کہ وہ غروب ہو گئے؛ مگر یہ تو ہے خدا، یہ تو بہت چمک دار ہے، بڑا حسین ہے، بڑا جمیل ہے، دنیا بھر کو روشنی دے رہا ہے۔ اس کے بعد وہ بھی غروب ہوگیا، تو کہنے لگے، یہ بھی میرا خدا نہیں ہوسکتا۔

پھر سورج کو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ میرا خدا ہے اور سب سے بڑا بھی ہے، دیکھو وہ سارے عالم کو اس طرح منور کیے ہوئے ہے کہ ذرہ، ذرہ اس سے روشن ہے۔ کہنے لگے ﴿ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَآ اَکْبَرُ﴾ کہ یہ میرا رب ہے، یہ بہت بڑا ہے؛ لیکن ظاہر بات ہے کہ صبح میں نکلا ہوا سورج شام میں غروب تو ہوتا ہی ہے، جب وہ بھی شام میں غروب ہوگیا، تو حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے فرمایا کہ دیکھو یہ بھی خدا نہیں ہے، جو ختم ہونے والا ہے، دنیا کی چیزوں پر حالات طاری ہوتے ہیں، حوادث پیش آتے ہیں، اس لیے یہ خدا نہیں ہوسکتے، خدا تو باقی

رہنے والا ہے۔ تو یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک تدبیر تھی مشرکین کو سمجھانے کے لیے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اسی سے دل لگاؤ۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ عیب فنا ہونے کا تو سب مخلوقات کے اندر ہے کہ سب کے سب فنا کے گھاٹ اترنے والے ہیں۔ مثلاً انسان ہے، کتنے دن جیے گا؟ آخر کار ختم ہو جائے گا، عورت ہے، کتنے دن جیے گی، ایک نہ ایک دن مرجائے گی، حُسن ہے کب تک رہے گا؟ کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گا۔

فنا سب سے بڑا عیب - سلیمان بن عبدالملک کا واقعہ

اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا، سلیمان بن عبدالملک کا نام آپ نے سنا ہوگا، بہت بڑا بادشاہ تھا، امیر المؤمنین تھا، جوانی میں اللہ نے اس کو بادشاہت دے دی تھی، بڑا ذی وجاہت بھی تھا اور حسین وجمیل بھی تھا، ایک دن اس نے اپنے آپ کو خوب اچھی طرح سنوارا، بنایا، بہترین کپڑے پہنے، عمامہ زیب تن کیا، خوشبوئیں لگایا، بہت ساری چیزوں سے اپنے آپ کو آراستہ پیراستہ کیا اور خدا کی نوازش سے حسین و خوبصورت بھی تھا۔

اس کے بعد اپنے دربار میں رونق افروز ہوا اور اپنے آپ پر وہ پھولے نہیں سما رہا تھا، سب لوگ دیکھ کر اس کی تعریف کرنے لگے، اتنے میں اس کی ایک باندی آئی، جب باندی آئی، تو اس نے باندی کو دیکھ کر مسکرایا اور پھر اس کے بعد کہا کہ میں کیسا لگ رہا ہوں؟ تو باندی نے اس کے جواب میں فی البدیہہ عربی میں دو شعر کہے

أَنْتَ نِعْمَ الْمَتَاعُ لَوْ كُنْتَ تَبْقٰى
غَيْرَ أَنْ لَّا بَقَاءَ لِلْإِنْسَان
أَنْتَ خِلْوٌ مِّنَ الْعُيُوْبِ وَ مِمَّا
يَكْرَهُ النَّاسُ غَيْرَ أَنَّكَ فَان

عجیب اشعار کہے اس نے، ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بادشاہ سے کہا: (اے کاش! کہ اگر آپ باقی رہنے والے ہوتے، تو آپ بہت ہی بہترین چیز تھے؛ لیکن کیا کروں کہ کسی بھی انسان کو بقا و دوام ہے ہی نہیں، سب فنا ہونے والے ہیں، آپ کے اندر کوئی عیب نہیں ہے، سارے ان عیبوں سے آپ پاک ہیں، خالی ہیں اور ان سب باتوں سے بھی پاک ہیں، جن سے لوگ نفرت کرتے ہیں اور برا سمجھتے ہیں؛ لیکن ایک عیب ہے آپ کے اندر، وہ یہ کہ آپ فانی ہیں)۔

دیکھیے! اس باندی نے حقیقت کو سمجھا اور حقیقت کو اس کے سامنے بیان کر دیا کہ آپ میں بڑے کمالات و خوبیاں ہیں؛ مگر یہ کیا کم عیب ہے کہ آپ مر جانے والے ہیں، اگر باقی رہتے، تو واقعی عشق کے قابل تھے، دل لگانے کے قابل تھے، محبت کرنے کے قابل تھے، تعلق کرنے کے قابل تھے؛ لیکن آپ کے اندر فنا کا ایک عیب ایسا ہے، جس نے ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔ بس یہ کہنا تھا کہ اس کے اوپر عجیب کیفیت طاری ہوگئی، اس کے بعد اس نے مجلس برخواست کر دی اور باندی کو اپنے کمرہ میں بلایا اور بلا کر کہا کہ تو نے میرے بارے میں یہ کیوں کہا؟ تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ مجھے جو حقیقت سمجھ میں آئی، اس کو میں نے بیان کر دیا، اس کے بعد اس نے اس کو انعام بھی دیا اور کہا کہ میری آنکھیں تو نے کھول دیں۔ اسی کے چند دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا، جوان ہی تھا جوانی ہی میں اس کی وفات ہوگئی۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ دنیا کیسی ہی خوبیوں کی مالک کیوں نہ ہو؛ لیکن اس کے اندر یہ عیب تو ہے ہی کہ یہ تو فنا ہونے والی ہے۔ سورج سے کیا دل لگانا، چاند سے کیا دل لگانا، آسمان سے کیا دل لگانا، زمین سے کیا دل لگانا، عورت سے کیا دل لگانا؟ یہ تو دل لگانے کے قابل نہیں؛ بل کہ دل سے نکالنے کے قابل ہیں، دل لگانے کے

قابل اور محبت کرنے کے قابل تو صرف اللہ کی ذات ہے، جس کو کبھی فنا نہیں ہے، جس میں کوئی عیب نہیں ہے، جو "**المستجمع لجميع صفات الكمال**" (ساری خوبیوں کا جامع) ہے۔

اللہ کی اور غیر اللہ کی محبت کا اجتماع ناممکن - سمنون محب ؒ کا واقعہ

یادرکھیے! کہ جب تک دنیا کی محبت اس دل میں گھسی رہے گی، اللہ تعالیٰ کی محبت بالکل نہیں آسکتی، دو چیزوں میں تضاد ہے، اللہ کی محبت اور غیر اللہ کی محبت میں۔

حضرت سمنون محبؒ رَحِمَہُ اللّٰہُ بہت بڑے اللہ کے ولی گزرے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے نکاح کیا، اس شرط پر کہ وہ دین پر قائم رہے گی، شریعت کے اوپر چلتی رہے گی۔ نکاح ہوگیا، اس سے مجھے ایک بچی پیدا ہوئی، بچی بڑی پیاری تھی، اس لیے میرا دل اس بچی میں لگ گیا، میں بار بار اس کی طرف دیکھتا اور اسی میں مشغول رہنے لگا، اس بچی کی محبت نے میرے اوپر غلبہ پالیا اور جو اللہ تعالیٰ کی محبت کی کیفیت دل میں پاتا تھا اس میں کمی ہونے لگی، پہلے تو اللہ کی محبت ایسی گھسی ہوئی اور بسی ہوئی تھی کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔

حضرت سمنون رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! میں دل کے اندر محسوس کرتا ہوں کہ تیری محبت میں کمی ہورہی ہے، مجھے بتادے کہ یہ کیوں ہورہی ہے؟ کہتے ہیں کہ رات سویا، تو خواب کے اندر دیکھا کہ ایک ابر کا سایہ ہے، اس کے اندر بڑی ٹھنڈک معلوم ہورہی ہے اور ایک نورانیت ہے، بہت سارے لوگ اس کے اندر جمع بیٹھے ہیں، میں نے خواب ہی میں کسی سے پوچھا کہ لوگ کیوں بیٹھے ہیں اور یہ کون لوگ ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ یہ عشاقِ خداوندی ہیں، عاشقانِ الٰہی ہیں، اللہ تعالیٰ کی محبت میں چور اور سرشار لوگ ہیں، یہ یہاں پر جمع

ہیں، کہتے ہیں کہ میں بھی جا کر ان لوگوں میں بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا، تو ایک آدمی آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے باہر کر دیا، میں نے کہا کہ بھائی! میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں، میں بھی اللہ سے محبت کرتا ہوں، میں بھی اللہ کی محبت میں سرشار رہتا ہوں، مجھے بھی ان میں بیٹھنے دے، تو وہ کہنے لگا کہ نہیں، تو ان میں داخل نہیں ہے؛ اس لیے کہ تیرے دل میں تو تیری بچی کی محبت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے خواب ہی میں پھر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔

دعا یہ کی کہ اے اللہ! اگر اس لڑکی کی محبت نے تیری محبت کو میرے دل سے قطع کر دیا ہے، تو اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے؛ اس لیے اے اللہ! تیری محبت دے کر اس کی محبت کو نکال دے۔ کہتے ہیں کہ میں نے یہ دعا کی خواب ہی میں، تو خواب ہی میں میں دیکھ رہا ہوں کہ عورتوں کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی، آنکھ کھلی، تو دیکھا کہ واقعی عورتیں رو رہی ہیں، میں نے پوچھا کہ کیا بات ہو گئی؟ تو کہا کہ بچی اوپر چڑھی تھی، ابھی گر کر مر گئی۔

اللہ اکبر! بڑا عبرت ناک واقعہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ایسے عشاق تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (ایمان والے اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں) اس میں ذرا سی کمی انھوں نے محسوس کی، تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ التجا کی۔

آج ہم لوگ غور کریں کہ ہمارے دل میں کتنے لوگوں کی محبت ہے، بے شمار چیزوں کی محبت ہے اور صرف محبتیں نہیں ہیں؛ بل کہ غالب محبتیں ہیں، اللہ کی محبت کہیں ایک کونے میں پڑی ہوئی ہے اور اس کا کوئی احساس بھی ہم کو نہیں ہو رہا ہے اور اس احساس کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے کوئی آثار بھی ہمارے اوپر مرتب ہوتے دکھائی نہیں دیتے اور یہ حضرات ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں چور ہیں، سرشار ہیں اور اس کے اندر ذرا سی کمی محسوس ہو رہی ہے، تو اللہ تعالیٰ سے درخواست

ہو رہی ہے کہ اے اللہ ایسا کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ بتائی۔

دعائے محبت کی تشریح

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے بہت ساری دعائیں مانگی ہیں، ان میں سے ایک دعا یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں فرماتے ہیں"**اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي وَ أَھْلِي وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ**"(اے اللہ! مجھے آپ کی محبت میرے نفس سے بھی زیادہ عطا فرما اور میرے اہل وعیال سے بھی زیادہ عطا فرما اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبت عطا فرما) (ترمذی: ۳۴۹۰)

یہ دعا اور درخواستِ محبت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محبت کا سوال کر رہے ہیں؛ مگر سوال کا انداز دیکھیے کہ کس قدر نرالا ہے؟ ہر آدمی کو اپنی جان بڑی محبوب ہوتی ہے، اسی لیے اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی جان کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتا ہے، جو جی میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو اپنی جان محبوب ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اے اللہ! مجھے میری جان سے بھی زیادہ آپ کی محبت دے دیجیے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سوال اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے نزدیک یہ مطلوب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ مطلوب ہے کہ اللہ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ مطلوب نہ ہوتا تو سوال میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کیوں پیش کرتے؟ یہ طلب دلیلِ مطلوبیت ہے؛ لہٰذا اپنی جان سے زیادہ اللہ کی محبت اپنے دل میں سمانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس دعا میں دوسری بات یہ فرمائی: "وأھلي" کہ آپ مجھے اپنی محبت میرے اہل

وعیال سے بھی زیادہ دیجیے۔ جیسے جان سے محبت فطری ہے، ایسے ہی اہل وعیال کی محبت بھی فطری ہے، بچوں سے محبت ہوتی ہے، اسی طریقے پر بیوی سے محبت ہوتی ہے، رشتہ داروں سے محبت ہوتی ہے، اہلِ خاندان سے محبت ہوتی ہے، ماں، باپ سے محبت ہوتی ہے، ان سب لوگوں سے محبت ایک فطری چیز ہے؛ لیکن ان سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہونی چاہیے، دوسروں سے بھی محبت تو ہو؛ لیکن غلبہ اللہ کی محبت کو ہونا چاہیے۔

اور تیسری بات فرمائی" ومن الماء البارد" کہ آپ کی محبت ٹھنڈے پانی کی محبت سے زیادہ دے دیجیے۔ ٹھنڈا پانی بھی اچھا لگتا ہے، ہر آدمی چاہتا ہے کہ ٹھنڈا پانی پیے، موسم سخت ہو، گرمی کا ہو، لو چل رہی ہو، دوپہر کا وقت ہو، پسینہ نکل رہا ہو، حلق میں کانٹے پڑ رہے ہوں، ایسے وقت آدمی چاہتا ہے کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی مل جائے اور جب ٹھنڈا پانی پیتا ہے، تو اَنگ اَنگ سے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا ہوتا ہے، دل سے اللہ کا شکریہ ادا ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کو بھی میٹھا اور ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب وپسند تھا، اس لیے آپ ﷺ کے لیے اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

(مشکوٰۃ : ۱۲۳۳-۱۲۳۴)

یہ اس لیے کہ ٹھنڈا پانی پینے سے اللہ تعالیٰ کا شکر دل سے ادا ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ٹھنڈا پانی بہت محبوب ہوتا ہے، تو اللہ کے نبی ﷺ کہتے ہیں کہ ٹھنڈے پانی سے زیادہ اللہ! تیری محبت مجھے چاہیے۔ اس دعا سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی محبت مانگی ہے۔

اس بارے میں اور بھی دعائیں ہیں؛ ایک دعا میں یہ الفاظ فرمائے: " اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ أَحَبَّ الْأَشْیَاءِ إِلَیَّ" (اے اللہ! اپنی محبت تمام چیزوں کی محبت سے زیادہ مجھ کو عطا فرما) (حلیۃ الأولیاء: ۲۸۲/۸، الحزب الأعظم)

اس میں تمام چیزوں سے زیادہ اللہ کی محبت مانگی ہے، یہاں سب کی سب

چیزوں کا ذکر کر دیا، اس میں کچھ بھی نہیں چھوٹا، نہ بیوی، نہ بچے، نہ کوئی اور چیز، سب چیزیں اس کے اندر آ گئیں۔ تو معلوم ہوا کہ اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ ہمارے دل میں اللہ کی محبت کو بسالیں اور ساری دنیا اور اس کی چیزوں سے اللہ کی محبت غالب ہو۔

جمالِ خداوندی

اللہ تعالیٰ ہی سے سب سے زیادہ محبت کیوں ہو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات میں اسبابِ محبت سب کے سب جمع ہیں اور سب سے زیادہ اس میں پائے جاتے ہیں، وہ اسباب کیا ہیں؟

عام طور پر محبت کا باعث وسبب حسن و جمال ہوا کرتا ہے، لوگ حُسن کو دیکھ کر دیوانے ہو جاتے ہیں؛ جب کہ یہ دنیا کی مختلف چیزوں اور انسانوں کا حسن و جمال ذاتی و خانہ ساز نہیں ہے اور نہ تو پائیدار اور باقی رہنے والا ہے، جب اس حسنِ فانی و ناپائیدار پر لوگ فدا ہو جاتے ہیں، تو اب سوچیے کہ اللہ جل جلالہ کا جمال ذاتی بھی ہے اور باقی بھی، اعلیٰ بھی ہے اور اول بھی، تو کیا اس کے حسن پر فدا نہ ہونا چاہیے؟

بھائیو! اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے، اس پر اپنی جان قربان کی جائے۔ مولانا حکیم اختر صاحب رحمہ اللہ نے اسی کو اپنے اشعار میں فرمایا۔

ہزاروں حسن کے پیکر، لحد میں دفن ہوتے ہیں
مگر عشاق ناداں مبتلا ہیں، خوش گمانی میں

نہ کھا دھوکہ کسی رنگینیٔ عالم سے اے اختر!
محبت خالقِ عالم سے رکھ، اس دارِ فانی میں

غرض! یہ کہ دنیوی چیزوں کا حسن و جمال ختم ہو جانے والا ہے، ناپائیدار ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جمال حقیقی بھی ہے، ذاتی بھی ہے اور باقی بھی؛ لہٰذا دل لگانے اور

محبت کرنے کے قابل صرف اللہ کی ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کا جمال کیسا ہوگا؟ اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟ پھر وہ جمال بھی بے کیف جمال ہے، جس کا ادراک یہاں ممکن نہیں؛ البتہ احادیث میں اس کا جو ذکر آیا ہے، اس کو پڑھنے سے فی الجملہ اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

جنت میں دیدارِ خداوندی

چناں چہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہلِ جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے، تو ان کو ایک ہفتے کی مقدار پر اللہ تعالیٰ کی زیارت کی اجازت ہوگی اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی زیارت کریں گے، اللہ کا عرش ان پر ظاہر ہوگا اور جنت کے باغات میں سے ایک باغ ان کے لیے ظاہر کیا جائے گا اور اس میں نور کے، لؤلؤ کے، یاقوت کے، زبرجد کے اور سونے اور چاندی کے ممبر رکھے جائیں گے اور ان میں سے جو سب سے کمتر درجے کا ہوگا، وہ مشک و کافور کے ٹیلے پر بٹھایا جائے گا۔

اس روایت کے آخر میں ہے کہ جب یہ جنتی مرد اس مجلس سے واپس ہوں گے اور اپنی جنتوں میں اپنی بیویوں سے ملیں گے، تو وہ کہیں گی کہ مرحبا! مرحبا! تم پر آج ایک ایسا جمال ہے کہ جب تم یہاں سے گئے تھے، تو وہ جمال نہیں تھا، یہ کیا بات ہے؟ مرد جواب دیں گے کہ آج ہم اپنے رب کی زیارت کر آئے ہیں، اس لیے ہم ایسے حسین و جمیل ہو گئے۔ (ترمذي: ۲/ ۸۱)

بعض احادیث میں آیا کہ جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے کہ کیا تم مزید کچھ چاہتے ہو؟ وہ عرض کریں گے کہ

اے اللہ! آپ نے ہمارے چہروں کو رونق بخشا اور ہمیں جنت میں داخل کیا اور نجات عطا فرمائی؛ پھر اور کیا ہم چاہیں؟ اس پر اللہ تعالیٰ ان کی نظروں سے پردہ ہٹادیں گے اور وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے، اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ جنتیوں کو اللہ کے دیدار سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ ہوگی۔

(مسلم :۲۹۷،ترمذی: ۲۵۵۲)

ان روایات سے کچھ کچھ اندازہ، اللہ کے جمال کا ہوسکتا ہے کہ وہ کیسا ہوگا کہ جنت کے جنتی، اس جمال کی زیارت سے مشرف ہوں گے،تو ان چہروں پر بھی مزید جمال پیدا ہوجائے گا اور یہ کہ جنت کی ساری محبوب و پسندیدہ چیزیں اپنی جگہ؛ مگر اللہ کے جمال کی زیارت کا لطف ولذت ہی کچھ اور ہوگا اور سب سے زیادہ محبوب یہی دیدارِ الٰہی ہوگا۔

کمالِ خداوندی

دوسری وجہ کسی سے محبت کی یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی کمال ہوتا ہے، جیسے اپنے شیخ واستاذ سے لوگ محبت کرتے ہیں؛ کیوں کہ ان میں علمی و عملی کمال پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کے علوم وفنون میں جو ماہر ہوتے ہیں، ان سے محبت ان کے کمال ہی کی وجہ سے ہوتی ہے؛ مگر یہ ظاہر ہے کہ ان تمام کے کمالات فانی اور ناقص ہیں، اس کے باوجود ہمیں اپنے اساتذہ ومشائخ اور دیگر اہلِ علم وفن سے محبت ہوتی، تو کیا اللہ سے محبت نہ ہونا چاہیے، جس کی ذات میں جو کمالات ہیں، وہ ذاتی اور باقی ہیں اور اعلی واکمل ہیں، وہ کون سا کمال ہے، جو خدا تعالیٰ میں نہیں ہے؟ وہ تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ہے؛ چناں چہ علما نے اللہ کی تعریف ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ ”اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے، جو تمام صفاتِ کمالیہ کی جامع ہے“ اور اس کا ہر کمال، کمال کو پہنچا ہوا ہے،

اس میں کوئی نقص نہیں، کوئی کمی نہیں، کوئی عیب نہیں۔

اس کے علم کو دیکھو، تو وہ غیب وشہادت سب کو برابر حاوی ہے، کوئی ذرہ بھی اس کے علم سے خارج نہیں، اس کی قدرت کو دیکھو کہ تمام ممکنات اس کے زیرِ تصرف، کوئی چیز اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں، ایسی قدرت کا مالک کہ جب کسی شے کو منصۂ شہود پر جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے، تو صرف "کن" کہنے سے وہ شے موجود ہو جاتی ہے، اس کی حکمت کو دیکھو کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے مستفید ہے، اس لیے ہر چیز کا ایک نظام ہے، ایک قاعدہ واصول ہے، ایک طریقِ عمل مقرر ہے، زمین وآسمان، شمس وقمر، انسان وحیوان، ہوا وپانی، آگ ومٹی، شجر وحجر، جن وملائک، وغیرہ وغیرہ لاتعداد مخلوقات اس کی قدرتِ قاہرہ اور حکمتِ بالغہ کی آیات ونشانیاں ہیں، کیا کوئی اور ہے، جس میں ایسی قدرت ہو، ایسی حکمت ہو اور ایسا علم اس میں پایا جاتا ہو؟ نہیں! ہرگز نہیں!! تو پھر جب ہم معمولی علم وفن اور کمال کی وجہ سے دوسروں سے محبت کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ سے تو سب سے زیادہ محبت ہونی چاہیے؛ کیوں کہ اس کا کمال ذاتی وباقی ہے اور اس کا کمال تمام مخلوقات کے کمالات کا منبع ومخزن ہے؛ اس لیے وہی حقیقی معنے میں محبوب بننے کے قابل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بے مثال کمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت حکیم سنائی اپنے فارسی قصیدے میں کہتے ہیں۔

نتواں وصفِ تو گفتن کہ تو در وصف نہ گنجی

نتواں شرحِ تو کردن کہ تو در شرحِ نیائی

یعنی تیری تعریف کرنا ممکن نہیں ؛ کیوں کہ تو کسی کی تعریف کے پیمانے میں سما نہیں سکتا اور تیرے کمالات کی شرح بھی نہیں کی جاسکتی ؛ کیوں کہ تیرے کمالات

کسی کی شرح میں نہیں آسکتے۔

عطاونوالِ خداوندی

یہ ہوئی دوسری وجہ، جس کی بنا پر لوگ کسی سے محبت کرتے ہیں اور یہ وجہ بھی اللہ میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔اب لیجیے تیسری وجہ کہ کسی سے محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عطا و بخشش کا معاملہ کرتا ہے، جودوسخاوت سے پیش آتا ہے؛ چناں چہ غلام کو اپنے آقا سے محبت اسی عطاونوال کی وجہ سے ہوتی ہے، اسی طرح ماں باپ اور محسنین سے محبت اسی وجہ سے ہوتی کہ وہ احسان کرتے ہیں، عطا و بخشش کرتے ہیں، نوازتے ہیں۔

اب ذرا سوچیے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر رحم وکرم کرنے والا، عطا و بخشش کے دریا بہانے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ مخلوق کے عطاونوال اور رحم وکرم کا حال تو یہ ہے کہ جب تک اس کی تابع داری وفرماں برداری کی جائے اور اس کی ہمنوائی وہم آہنگی باقی ہو، تب تک یہ سلسلہ بھی جاری رہتا ہے اور جوں ہی اس کے خلاف کوئی بات صادر و ظاہر ہوتی ہے اس کی دادودہش کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور اپنے دروازوں سے دھتکار دیتا ہے؛ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت وکرم پر قربان جایئے کہ بندے ہزاروں نافرمانیاں اور سرکشیاں کرتے ہیں، پھر بھی وہ اپنی عطاو بخشش کے دروازے بند نہیں کرتا، کفار ومشرکین اس کی گستاخیاں کر کے مزے لیتے ہیں، اس کی تکذیب وتردید کرتے ہیں اور اس کے احکام وقوانین کا مذاق اڑاتے ہیں، مگران پر نہ کھانا بند کیا جاتا ہے نہ پانی، نہ ہوا روکی جاتی ہے نہ روشنی۔ جب کفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دادودہش اور عطاونوال کا یہ حال ہے، تو ماننے والوں پر کیا کچھ اس کی نوازشات وکرم فرمائیاں نہ ہوں گی۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو، تو ممکن نہیں کہ تم شمار کرلو، ہر آن اس کی نعمتوں کی بارش ہم پر ہو رہی ہے؛ بل کہ ہمارا وجود خود اس کی عظیم نعمت ہے، غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اعضا عطا فرمائے ہیں اور ان میں جو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں، کیا کوئی اور یہ دے سکتا ہے؟ ایک گردہ فیل ہو جائے، تو تمام ڈاکٹر اور دنیا کی تمام توانائیاں اور قوتیں مل کر بھی ایک گردہ انسان کو فراہم نہیں کر سکتے، اگر کوئی دے گا بھی، تو وہ خود اللہ کا بنایا ہوا ہی ہوگا، یا انسان نقل اتارے گا، تو وہ بھی اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کے سہارے اور واسطے سے بنائے گا۔

ایک ایک عضو پر غور کیجیے کہ وہ کیسی قیمتی نعمتیں ہیں اور بے بدل عطایا ہیں؛ پھر روزانہ کی ضروریات وحاجات کا کس طرح انتظام فرمایا ہے اور کتنی اور کیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں؟ کیا اس لحاظ سے بھی کوئی اور اس کا ہم رتبہ وہم پلّہ ہوسکتا ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں!! تو پھر کیا وہی اس بات کا مستحق نہیں ہوگا کہ اسی سے محبت کی جائے اور وہی ہمارا حقیقی محبوب ہو؟

غرض! یہ کہ ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اس لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے اور سب سے زیادہ محبت کی جائے۔

محبتِ الٰہیہ کا ثمرہ ''ایمانی حلاوت''

بزرگو اور دوستو! جب اللہ ورسول کی محبت دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور دنیا کی تمام محبتوں پر وہ غالب ہوتی ہے، تو اس کے صلے وثمرے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمانی حلاوت نصیب ہوتی ہے۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ

''تین باتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ پائی جائیں ،وہ ایمان کی حلاوت (مٹھاس) پائے گا:ایک یہ کہ اس کو تمام چیزوں سے زیادہ اللہ ورسول محبوب ہوں، دوسرے:یہ کہ کسی بندے سے محبت صرف اللہ کے لیے کرے اور تیسرے:یہ کہ کفر کی طرف لوٹنا اس کو اس قدر ناگوار ہو،جیسے کہ آگ میں ڈالا جانا ناگوار ہوتا ہے''۔

(مشکوٰۃ:۱۲)

حضرت نبی عربی، محمد مدنی ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین باتیں ایسی ہیں کہ جس کسی میں وہ پائی جائیں، اس کو حلاوتِ ایمانی نصیب ہوگی، ان تین میں سے ایک بات یہ فرماتے ہیں کہ اللہ ورسول کی محبت تمام چیزوں کی محبت پر غالب ہو،جس کو یہ دولت حاصل ہوجائے اس کو ایمان کی حلاوت نصیب ہوگی، یہ اللہ ورسول کی محبت کا صلہ وثمرہ ہے۔حلاوت مٹھاس کو کہتے ہیں اور عام علما نے فرمایا کہ اس سے روحانی ومعنوی مٹھاس مراد ہے۔

یہاں مجھے ایک بات اس کی تشریح میں یاد آگئی کہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ (جو بہت بڑے محدث گزرے ہیں) انھوں نے شیخ محی الدین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حلاوتِ ایمان سے مراد تین باتیں ہیں:ایک یہ کہ نیکی وعبادت سے لذت پائے،دوسرے یہ کہ دین کی خاطر مشقت وتکلیف کو برداشت کرے اور تیسرے یہ کہ دین کو دنیوی ساز وسامان کے مقابلے میں ترجیح دے۔(فتح الباری : ۱/۱ ۶)

شیخ محی الدین رحمہ اللہ نے حلاوت کی جو تفسیر وتشریح کی ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کو ظاہری مٹھاس پر نہیں؛بل کہ معنوی وروحانی مٹھاس پر محمول فرمایا ہے؛چناں چہ مشاہدہ بھی ہے کہ اولیا اللہ جو اللہ ورسول کی محبت میں سرشار ہوتے ہیں ،وہ عبادت وطاعت میں ایک کیف وسرور پاتے ہیں اور دین کے لیے ہزارہا قسم کے مصائب وشدائد برداشت کرتے ہیں اور اس میں بھی ان کو ایک لذت

محسوس ہوتی ہے؛ نیز وہ دنیوی و مادی ساز و سامان اور نفسانی خواہشات پر دین کو ترجیح دیتے اور دین کی خاطر ہر خواہش ولذت کو اور دنیوی آسائش وراحت کو قربان کر دیتے ہیں اور اس میں بھی ان کو حلاوت محسوس ہوتی ہے۔

طاعت کی لذت-ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

اللہ ورسول کی محبت جن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، ان کو نیکی وطاعت میں کیسا لطف وکیف محسوس ہوتا ہے اور وہ اس سے کیسے سرشار ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک دفعہ غزوۂ ذات الرقاع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ نکلے، راستے میں ایک جگہ آپ نے پڑاؤ ڈالا اور حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کون آدمی ہمیں پہرہ دے گا؟ اس کے جواب میں دو حضرات نے اپنا نام پیش کیا، ایک انصاری صحابی تھے، جن کا نام ''عباد بن بشر'' رضی اللہ عنہ تھا اور دوسرے مہاجر صحابی تھے، جن کا نام ''عمار بن یاسر'' رضی اللہ عنہ تھا، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم دونوں وادی کے اوپر والے حصے پر رہنا؛ چناں چہ یہ دونوں صحابہ وہاں پہنچے؛ پھر مہاجر صحابی تو لیٹ گئے اور انصاری صحابی عباد رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے راز ونیاز شروع کر دیا اور نماز میں مشغول ہو گئے، غالبًا ان حضرات نے یہ طے کر لیا ہوگا کہ آدھی رات ایک شخص پہرہ دے اور پھر آدھی رات دوسرا پہرہ داری کرے۔ جب حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ نماز میں اللہ تعالیٰ سے سرگوشی ومناجات میں مشغول ہو گئے، تو ایک مشرک آدمی آیا اور چھپ کر ان پر تیر برسانے لگا، یہ صحابی برابر نماز میں مشغول رہے، اس مشرک نے تین تیران پر چلائے، ان صحابی نے تیر تو نکال کر پھینک دیا؛ مگر نماز نہیں توڑی، برابر نماز میں رہے اور رکوع وسجدہ کر کے جب نماز سے فارغ ہوئے، تو ان صحابی کو بیدار کیا جو

بازو لیٹے ہوئے تھے، انھوں نے اٹھ کر دیکھا، تو یہ لہولہان ہیں، عرض کیا کہ سبحان اللہ! تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ جگا دیا، فرمایا کہ میں ایک سورت پڑھ رہا تھا، میں نے نہیں چاہا کہ اس کو ادھورا چھوڑ دوں۔ بعض روایات میں ہے کہ ان صحابی نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر رسول اللہ ﷺ نے مجھے حفاظت ونگرانی کی ذمہ داری نہ دی ہوتی، تو میں قتل ہو جاتا؛ مگر اس سورت شریفہ کو ادھورا نہ چھوڑتا۔

(ابوداود:۱۹۸، مسند احمد: ۳/۳۴۳، صحیح ابن حبان: ۳/۳۷۵، صحیح ابن خزیمہ: ۱/۲۴، مستدرک: ۱/۲۵۸)

اللہ اکبر! کیا لذت ولطف تھا، جوان صحابی کو تلاوتِ کلام اللہ اور نماز میں محسوس ہو رہا تھا، جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ہلاک کر لینے پر بھی راضی ہیں؛ مگر تلاوت ونماز کو قطع کرنے پر راضی نہیں۔ یہ حلاوتِ ایمانی ہے، جو اللہ ورسول کی محبت کا صلہ وثمرہ ہے۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور شوقِ شہادت

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، جنگِ صفین میں ان کی شہادت ہوئی۔ شہادت سے قبل نہایت بے چینی سے شہادت کا انتظار کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے بتایا تھا کہ میں اسی دن شہید ہوں گا؛ مگر کیا بات ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں؟ نیز فرما رہے تھے کہ آج میں جبار یعنی اللہ تعالیٰ سے ملوں گا اور حورِ عین سے شادی کروں گا اور میرے محبوب لوگوں حضرت محمد ﷺ اور ان کی جماعت سے ملوں گا، پھر لڑتے، لڑتے شہید ہو گئے۔ (حیاۃ الصحابۃ: ۱/۶۸۴)

غور کیجیے! کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو شہادت کی طلب اور جستجو اور اس کا انتظار اللہ ورسول کی محبت ہی کی وجہ سے ہوا اور اسی محبتِ خداوندی ومحبتِ رسول نے موت کو ان

کے لیے لذیذ ولطف آمیز چیز بنا دیا تھا۔

غرض! یہ کہ اس حدیث میں مراد لذت وحلاوتِ روحانی ہے، جو اللہ ورسول کی محبتِ غالبہ وشدیدہ کے صلے میں ایک مؤمن کو نصیب ہوتی ہے۔

حلاوتِ ایمانی کی دوسری تفسیر

مگر بعض علمانے فرمایا کہ روحانی ومعنوی لذت وحلاوت تو ملتی ہی ہے، اس کے ساتھ حِسی حلاوت ومٹھاس بھی ملتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ حلوہ وشکر ومٹھائی کھانے سے انسان کو حسی طور پر اس کی حلاوت ومٹھاس معلوم ہوتی ہے۔

چناں چہ علامہ علی القاری رَحِمَہُ اللّٰہُ شرحِ مشکوۃ میں ایک دوسری حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابنِ حجر رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا کہ ایمان کی لذت ومزے سے مراد حسی ومعنوی دونوں طرح کی لذت ومزہ ہے۔ (مرقات: ۱/۶۷)

معلوم ہوا کہ بعض حضرات اس جگہ مٹھاس ولذت سے حسی ومعنوی دونوں طرح کی حلاوت ولذت مراد لیتے ہیں۔ واقعی جو عشق، محبتِ الٰہی سے چور ہوتا ہے، اس کو کبھی حسی طور پر بھی اللہ ورسول کے نام میں حلاوت معلوم ہوتی ہے۔

مولانا جلال الدین رومی رَحِمَہُ اللّٰہُ ایسے ہی اولیا اللہ میں سے تھے؛ چناں چہ خود ہی فرماتے ہیں ؎

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام! ☆ شیر وشکر می شود جانم تمام

(یعنی یہ فرماتے ہیں کہ یہ ’’اللہ، اللہ‘‘ کس قدر میٹھا نام ہے کہ اس نام سے میری پوری جان ہی دودھ اور شکر ہو جاتی ہے)

یعنی میں دودھ اور شکر کی سی مٹھاس اپنے اندر پاتا ہوں۔ ایک اور مقام پر مولانا رومی رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں ؎

نامِ اُو چوں بر زبانم می رود ☆ ہر بنِ مو از عسل جوئے شود

(یعنی جب اللہ پاک کا نام میری زبان پر جاری ہوتا ہے، تو میرے بال، بال سے شہد کی نہریں جاری ہو جاتی ہیں)

یہ حلاوت و شیرینی، جو اللہ پاک کے نامِ پاک سے محسوس ہو رہی ہے اللہ کی محبت کا نتیجہ ہے۔ غرض یہ کہ جب بندہ اللہ و رسول کی محبت میں سرشار ہوتا ہے، تو اس کو حلاوتِ ایمانی کی عظیم دولت حاصل ہوتی ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی اللہ تعالیٰ سے محبت

ایک صحابی کا واقعہ ہے کہ چند صحابہ کو ایک علاقے میں جانا پڑا، تو وہاں کے بادشاہ نے ان کو گرفتار کرنے کا حکم دیا، اس کے فوجیوں نے پکڑ کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا، بادشاہ عیسائی تھا، اس نے کہا کہ تم عیسائی بن جاؤ، انھوں نے کہا کہ ہم عیسائی نہیں بنتے، ہم تو مسلمان ہیں، ایک اللہ کو ماننے والے ہیں، ہم اسی ایک اللہ کا سبق ساری دنیا کو سکھانے کے لیے نکلے ہیں۔

اس نے کہا کہ یا تو تمہیں میری بات ماننی ہوگی یا نہیں تو میں تمہارے ساتھ سخت سلوک کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی مرضی، جو چاہیں آپ کریں؛ لیکن ہم تو اپنے دین سے اور اپنے اللہ سے پھرنے والے نہیں۔

قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِيْ اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ الخ﴾ (اے مسلمانو! تم میں سے کوئی اگر دین سے پھر جائے، تو اللہ دوسری قوم کو پیدا کر دے گا، جو اللہ سے محبت رکھے گی، اللہ ان سے محبت رکھے گا)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسی قوم پسند ہے، ایسے مسلمان پسند ہیں، جو اللہ کی

محبت میں چور ہوں، سرشار ہوں؛ اس لیے اس کا ذکر کیا کہ تم پھرنا چاہو، تو پھر جاؤ، ہمیں کوئی پرواہ نہیں، ہم دوسری قوم کو پیدا کریں گے، جو ہم سے محبت کرنے والی ہوگی اور پھر اس کے نتیجے میں ہم بھی اس سے محبت کریں گے۔

تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہنے لگے کہ تو جو چاہے کر، ہم تو پھرنے والے نہیں۔ تو اس نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ ایک کڑھائی میں تیل ڈالو اور نیچے سے آگ جلاؤ؛ چناں چہ بہت بڑی کڑھائی میں تیل ڈالا گیا اور نیچے سے آگ جلائی گئی اور خوب زبردست طریقے پر اس تیل کو پکایا گیا، جب وہ بالکل پک گیا اور کھولنے لگا، تو اس نے ان دو حضرات میں سے پہلے ایک صحابی کو اٹھا کر اس میں ڈالنے کا حکم دیا؛ جب ان صحابی کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا، تو وہ کباب کی طرح اس میں جل بھن گئے، کھولتا ہوا تیل تھا اور تپ رہا تھا اور پکا ہوا تھا، بس یوں ڈالا اور ان کی جان نکل گئی، ختم ہو گئے۔

اس کو دیکھ کر جو دوسرے صحابی تھے، وہ رونے لگے، بادشاہ نے یہ سمجھا کہ شاید ان کا دل کچھ نرم ہو گیا ہے، اب یہ میری بات مان لیں گے؛ لہٰذا ان سے کہا کہ دیکھو! تمہارا بھی یہی حشر ہوگا، اگر تم نے میری بات نہیں مانی، اس لیے میری بات مان لو اور رونے کے بہ جائے میری بات مان کر تم اپنی جان بچالو۔ وہ صحابی کہنے لگے کہ تجھے دھوکا ہو رہا ہے، میں اس لیے نہیں رو رہا ہوں کہ میں ان کی جان کو یوں نکلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، یہاں مجھے کوئی خوف اور کوئی دہشت اور کوئی وحشت نہیں ہو رہی ہے؛ بل کہ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ میں نے دیکھا کہ جوں ہی ان صحابی کو اس تیل میں ڈالا گیا ذرا سی دیر میں ان کی جان نکل گئی، تو میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے بھی تو اس میں ڈالے گا، تو میری بھی اسی طرح جان نکل جائے گی، پھر میرے پاس اللہ کی محبت میں قربانی دینے کے لیے کوئی دوسری جان نہیں ہوگی، اس لیے میں

رو رہا ہوں کہ ایک ہی جان ہے اور کہنے لگے کہ اگر میرے پاس سو جانیں ہوں، تو میں یہ خواہش کروں گا کہ بار بار میری جان کو اس میں ڈالا جائے اور میں سو مرتبہ اللہ کی محبت میں قربان ہو جاوں۔ (حياة الصحابة: ١/٢٤٧)

اللہ اکبر! کیا محبت تھی اللہ سے، کیسا عشق تھا صحابہ کا، کیا دنیا کا کوئی عاشق محبت کی ایسی مثال اور نظیر پیش کرسکتا ہے؟ حدیث میں بھی آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں مجھے قتل کیا جائے، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں''۔

(بخاري: ٢٦٤٤، معجم أوسط: ٨/٣٣٣، مصنف عند الرزاق: ٥/٢٥٤)

یہ اللہ کے راستے میں مرنا اللہ کی محبت میں مرنا ہے، جب یہ محبت غالب ہوتی ہے، تو اس کا یہ حال ہوتا ہے؛ بل کہ جو اس راہ میں آتا ہے اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے راستے میں مروں اور شہید ہو جاؤں، میں نے اپنی ایک نظم میں یہ شعر کہا ہے، جو اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے ؎

عشقِ حق میں مرنا ہی قربِ حق کا رستہ ہے
شوق گر ہو مرنے کا، رکھ قدم سفینے میں

جی ہاں! جس کو اللہ کے راستے میں مرنا ہے، وہی اس راہ میں قدم رکھے گا، جس کو جینا ہو، عیش و راحت میں رہنا ہو، اس کو اس راہ سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے محبت

میں نے حضرت مولانا ذو الفقار احمد صاحب دامت برکاتہم کی بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ایک مرتبہ بکریاں چرا رہے تھے، راستے میں ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی محبت میں یہ تسبیح پڑھتا ہوا جا رہا تھا: ''سبحٰن

الملک القدوس سبحٰن ذي العزة والهيبة والكبرياء والجبروت" حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ جملے بڑے اچھے لگے اور ظاہر بات ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے، اس کے ذکر سے دل کو لذت ملتی ہے اور دل اس کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔

لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس آدمی سے درخواست کی کہ وہ اللہ کی تعریف کے یہ جملے ایک بار دُہرائے، تو اس نے کہا کہ میں دوبارہ پڑھوں گا، تو آپ کیا دینگے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ آدھی بکریاں دے دوں گا، اس نے وہ تسبیح دوبارہ پڑھ دی اور آپ علیہ السلام نے اپنی آدھی بکریاں اس کو دے دیں؛ مگر جب آپ علیہ السلام نے ان جملوں کو سنا، تو محبتِ خداوندی سے اور زیادہ بے قرار ہو گئے اور اس سے ایک بار پھر پڑھنے کی درخواست کی، تو اس نے پوچھا کہ اب پڑھوں، تو کیا دو گے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بقیہ آدھی بکریاں بھی دے دوں گا، تو اس نے پھر ان جملوں کو پڑھ دیا اور آپ نے باقی بکریاں بھی اس کو دے دیں؛ مگر ابراہیم علیہ السلام کی پیاس نہیں بجھی، آپ نے اس سے پھر پڑھنے کے لیے فرمایا، تو اس نے کہا کہ اب تو آپ کی ساری بکریاں ختم ہو گئی ہیں، اب پڑھوں گا تو کیا دو گے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ جی ہاں! بکریاں تو ختم ہو گئیں اور کوئی چیز میرے پاس دینے کو نہیں ہے؛ مگر خود میری ذات تو موجود ہے اور آپ کو بھی کوئی بکری چرانے والا چاہیے؛ اس لیے ایک بار اور پڑھ دیجیے اور اس کے بدلے میں میں آپ کا غلام بن جاوں گا، آپ مجھ سے ان بکریوں کو چرانے کا کام لے لیں۔

یہ سن کر اس آدمی نے کہا کہ دراصل میں اللہ کا فرشتہ ہوں، تمہارا امتحان لینے آیا تھا کہ آپ کو اللہ سے محبت کتنی ہے؟ یہ میں دیکھنا چاہتا تھا، آپ کامیاب ہو گئے، یہ لیجیے آپ کی بکریاں۔

اللہ اکبر! کیا عجیب محبت تھی!؟ کیسا عشق تھا!؟ کہ ایک بار اللہ کا نام لینے اور اس

کی تسبیح بیان کرنے پر پہلے تو ساری بکریاں دے دیں؛ پھر خود اپنی ذات کو غلامی کے لیے پیش کر دیا۔

محبت کا معاملہ غیرت سے متعلق ہے

الغرض! اللہ سے محبت ایک عظیم دولت ہے اور اسلام میں اس کو مختلف پیرایوں میں واضح کیا گیا ہے، ہاں! مگر ایک بات یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا فرض ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے محبت کرنے کا ہمیں کہیں حکم نہیں دیا ہے، قرآن میں آپ کہیں بھی نہیں دکھا سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ اے میرے بندو! مجھ سے محبت کرو، جس طرح اللہ تعالیٰ نے دوسری باتوں کا حکم قرآن پاک میں دیا اس طرح اللہ سے محبت کرنے کا حکم کہیں نہیں دیا ہے: مثلاً قرآن میں تقوے کا حکم ہے:
﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (اے مومن بندو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو)۔

اسی طرح نماز کا حکم ہے: ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (نماز قائم کرو)، کہیں زکوٰۃ کا حکم فرمایا: ﴿اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (زکوٰۃ ادا کرو) وغیرہ۔

لیکن کہیں یہ نہیں فرمایا کہ اے میرے بندو! مجھ سے محبت کرو۔ وجہ یہ ہے کہ محبت کا معاملہ غیرت سے متعلق ہے، محبت کے ساتھ غیرت لازم ہے اور جہاں یہ مسئلہ ہوتا ہے، وہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم میرے سے محبت کرو۔ دنیا میں کسی معشوق کو دیکھا آپ نے کہ وہ کہتا ہو کہ میں اس قابل ہوں کہ تم میرے سے محبت کرو، کوئی نہیں کہتا، جب دنیا کا ادنیٰ معشوق بھی خود سے محبت کرنے کسی کو نہیں کہتا اور اس کو اس بات سے غیرت آتی ہے، تو اللہ تعالیٰ تو سب سے بڑے غیور ہیں، وہ کیسے حکم دے سکتے ہیں؟ اس لیے اللہ نے کہیں حکم نہیں دیا کہ تم مجھ سے محبت کرو؛ بل کہ جہاں بھی فرمایا وہاں ایک خبر کی حیثیت سے فرمایا جیسے ایک جگہ ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

أَشَدُّ حُبّاً لِّلّٰہِ﴾ (جو لوگ ایمان والے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کرتے ہیں)

لہٰذا تم بھی ایمان والے ہو، تو مجھ سے محبت کرو، میں نہیں کہتا کہ تم میرے سے محبت کرو؛ بل کہ جو ایمان والے ہوتے ہیں، وہ محبت کرتے ہیں، امر کا صیغہ نہیں فرمایا؛ بل کہ جملۂ خبریہ سے خبر دی کہ جو ایسے ہوتے ہیں، وہ ایسا کرتے ہیں، اب اگر تم بھی ایسے ہو، تو تم بھی ایسا ہی کرو، اگر تم ایسے نہیں ہو، تو ایسا نہ کرو، تمہاری مرضی کی بات ہے؛ اس لیے فرمایا کہ جو ایمان والے ہوتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔

محبتِ الٰہیہ کے آثار

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا اسلام میں مقصود ہے؛ بل کہ مقصودِ اعظم ہے، تو اب یہ بھی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثار اور اس کے لوازمات کیا ہیں؟ اللہ کی محبت کی علامتیں کیا ہیں؟ تاکہ اس کی روشنی میں ہم یہ طے کریں کہ ہمارے دلوں میں اللہ کی محبت ہے یا نہیں ہے؟ کیوں کہ محبت کا دعویٰ تو سب کرتے ہیں؛ مگر جب اس دعوے کی دلیل کا مطالبہ ہوتا ہے، تو بہت کم لوگ اس میں کامیاب ہوتے ہیں اور اکثر تو اس دعوے میں جھوٹے ہی نکلتے ہیں۔ آج کے دور میں بالخصوص غلط قسم کے پیروں اور جھوٹے شیوخ کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا ہے، جو محبتِ الٰہیہ کا دم بھرتے ہیں؛ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ اللہ کے احکام کو مسلسل توڑتے رہتے ہیں اور گناہوں میں ملوث رہتے ہیں اور عوام الناس کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم پہنچے ہوئے ہیں، اس لیے ہمارے سے احکام معاف ہوگئے؛ لہٰذا یہ بات اچھی طرح یاد رکھو کہ کوئی بھی شخص اللہ و رسول کی محبت کا دعویٰ کرے، تو اس کو اس کے آثار و لوازمات سے پہچاننا چاہیے۔

پہلی علامت-''اطاعتِ خداوندی''

اب سنو کہ محبتِ حق کے آثار کیا ہیں؟ سب سے بڑی اور سب سے بھاری علامت، محبتِ خداوندی کی اطاعت ہے، اگر آدمی خدا کا مطیع نہیں ہے، فرماں بردار نہیں ہے، اللہ کے احکام پر نہیں چلتا ہے، من مانی زندگی گزارتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی محبت کبھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوسکتی۔

اور یاد رکھیے کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرماں برداری کے دو حصے ہیں: ایک حصہ اُوامر پر چلنے کا اور دوسرا حصہ معاصی سے بچنے کا یعنی ایک تو وہ احکامات ہیں، جن کا اللہ نے ہمیں آرڈر (ORDER) دیا ہے، جن کا حکم دیا کہ تمھیں یہ کام کرنا ہے، جیسے نماز پڑھنا ہے، روزہ رکھنا ہے، زکوٰۃ دینا ہے، حج کرنا ہے، فلاں کام کرنا ہے، یہ کہلاتے ہیں اُوامر؛ ان سارے اوامر کو مان کر زندگی گزارنا ایک حصہ ہے اللہ کی اطاعت کا۔

اور دوسرا حصہ ہے اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ جتنے کام ہیں، ان سب کاموں سے اپنے آپ کو بچائے، اس کو کہتے ہیں اجتناب عن المعاصی یعنی معصیتوں سے بچنا۔ یہ بھی اللہ کی اطاعت میں داخل ہے، اس لیے کہ اللہ کی اطاعت اگر ہم صرف یوں کرلیں کہ نماز کا وقت آیا، تو نماز پڑھ لیا؛ لیکن جب گناہ سے بچنے کا وقت آیا، تو بچنے کے لیے تیار نہیں، تو اللہ کی پوری اطاعت نہیں ہوگی۔

بلکہ ایک بزرگ کی بات سناتا ہوں، انھوں نے فرمایا کہ گناہوں سے بچنا اصل اطاعت ہے، اصل ولایت ہے، اس لیے کہ نیکی کرلینا، تو نیک و بد سب کے یہاں مشترک ہے، فاسق وفاجر بھی کرلیتے ہیں، نیکی اچھے بھی کرلیتے ہیں اور برے بھی کرلیتے ہیں، نماز تو شرابی بھی پڑھ لیتا ہے، زناکار بھی پڑھ لیتا ہے، الٹا سیدھا

کرنے والا بھی پڑھ لیتا ہے۔ تو یہ نیکی کا کرنا اچھائی وخوبی تو بہر حال ہے؛ لیکن معیارِ ولایت نہیں ہے؛ لیکن معیارِ ولایت کیا ہے؟ معیارِ ولایت ہے گناہوں سے بچنا، جس کا نام ہے تقویٰ اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿اِنْ اَوْلِیَآؤُہٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الأنفال: ۳۴) (نہ بچنے والے ہی دراصل اللہ کے ولی ہیں)

لہٰذا جو اللہ کا ولی بننا چاہے، جو ولایت کا درجہ پانا چاہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ گناہوں سے بچے۔ ہاں! اس کے ساتھ اطاعت بھی یعنی نیکی بھی کرنا ہے۔ اس طرح دونوں کا جوڑ ہے، آپس میں گہرا ربط ہے، ایک آدمی نماز تو پڑھ لیتا ہے، روزہ تو رکھ لیتا ہے، زکوٰۃ تو دے دیتا ہے اور نیکیاں کر لیتا ہے؛ لیکن جہاں گناہ سے بچنے کا نمبر آتا ہے، نہیں بچتا، تو یہ اللہ کا ولی قیامت تک نہیں ہوسکتا؛ اس لیے کہ جو بھی اللہ کا ولی ہوگا، وہ اطاعت بھی کرے گا اور گناہوں سے بھی بچے گا۔

اللہ کے ولی کو کیسے پہچانیں؟ - ایک واقعہ

کسی آدمی کے بارے میں آپ کو جانچ کرنا ہے کہ یہ اللہ کا ولی ہے یا نہیں؟ تو دیکھیے کہ اطاعت اس کے اندر ہے، تو وہ اللہ کا ولی ہے، اگر اطاعت اس کے اندر نہیں ہے، تو وہ اللہ کا ولی کبھی نہیں ہوسکتا۔ بہت سارے لوگ ہوتے ہیں، جن کو لوگ پیر سمجھ کر ان سے بیعت بھی ہوجاتے ہیں اور ان کے ایسا حلقہ بگوش ہوجاتے ہیں کہ اللہ کو بھی بھول جاتے ہیں، رسول کو بھی بھول جاتے ہیں؛ لہٰذا اس معیار کو سامنے رکھ کر ایسے لوگوں کو آپ جانچ سکتے ہیں کہ یہ اللہ کے ولی ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ جب محبتِ خداوندی کی یہ پہلی علامت ہی ان میں نہیں ہے، تو یہ اللہ کے ولی کیسے ہوسکتے ہیں؟

ہاں! شیطان کے ولی اور دوست ہوسکتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جیسے

اولیا اللہ کا ذکر کیا ہے، اولیاء الشیطان کا بھی ذکر کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ ولی دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک ولی اللہ ہوتے ہیں، ایک ولی الشیطان ہوتے ہیں، جو اللہ کا ولی ہوتا ہے، وہ اطاعت گزار ہوتا ہے اور جو اللہ کا ولی نہیں ہوتا، وہ شیطان کا ولی ہے، وہ شیطان کو خوش کرنے کے لیے خدا کی نافرمانی کرتا رہتا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے شہر میں ایک بزرگ کے آنے کی خبر پھیلی، لوگ ان سے ملنے جا رہے تھے، تو وہ بزرگ بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ ان سے ملنے کے لیے نکلے، جب وہاں پہنچے، تو وہ صاحب وضو کر رہے تھے، جانے والے بزرگ دور ہی سے کھڑے ہو کر ان کو دیکھ رہے تھے، جب وہ وضو سے فارغ ہو گئے، تو یہ بغیر ملاقات ہی واپس جانے لگے، ملاقات نہیں کی، شاگردوں نے پوچھا حضرت! آپ ملاقات کرنے آئے تھے اور بغیر ملاقات کے جا رہے ہیں، کیا بات ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ میں ان کے وضو کے طریقے کو دیکھ رہا تھا، جو خلافِ سنت تھا، جسے وضو کی سنتیں معلوم نہ ہوں، وہ اللہ کا ولی کیسے ہو سکتا ہے؟

دیکھیے! صرف خلافِ سنت وضو کرنے کی وجہ سے اللہ والا ماننے تیار نہیں اور ہم ہیں کہ گناہ گاروں کو بھی پیر سمجھتے ہیں!!۔

سب سے بڑی کرامت - ایک واقعہ

اسی لیے بزرگوں نے فرمایا کہ سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ احکامِ خداوندی اور سنتِ نبوی کا اہتمام کیا جائے، اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا، جو میں نے مرشدی حضرت اقدس شاہ مسیح اللہ خان صاحب رَحِمَہُ اللہُ سے بارہا سنا ہے کہ ایک شخص نے حضرت جنید بغدادی رَحِمَہُ اللہُ کی شہرت سنی، تو ان کی خدمت میں پہنچا اور ان کی

خانقاہ میں دس سال رہا۔ ایک دن آ کر حضرت سے کہا کہ حضرت میں واپس جانا چاہتا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ تم دس سال تک جو یہاں رہے، اس کا کیا مقصد تھا اور کیا وہ مقصد تم کو حاصل ہو گیا؟ اس نے کہا کہ میں اس لیے آیا تھا کہ میں نے لوگوں سے آپ کا ذکر سنا تھا کہ آپ ولی اللہ ہیں، تو میں نے یہ سوچا کہ آپ سے بڑی بڑی کرامتیں ہوتی ہوں گی؛ لہٰذا آپ کی خدمت میں رہنے آیا، تاکہ آپ کی کرامت دیکھوں؛ مگر اب اس لیے جا رہا ہوں کہ میں نے آپ سے اس عرصے میں ایک کرامت بھی نہیں دیکھی۔

یہ سن کر حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کو جوش آ گیا اور فرمایا کہ اچھا بتاؤ، تم نے دس سال کے عرصے میں مجھے کبھی خلافِ سنت کوئی کام کرتے دیکھا ہے؟ اس نے اب غور کیا اور کچھ دیر کے بعد کہا کہ نہیں، آپ سے کبھی بھی خلافِ سنت کوئی کام ہوتے نہیں دیکھا۔ حضرت نے فرمایا کہ جنید کی اس سے بڑی کرامت کیا دیکھنا چاہتے ہو کہ اس نے دس سال میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے خدا کو ناراض نہیں کیا، کیوں کہ کوئی کام خلافِ سنت نہیں کیا۔

اللہ اکبر! دیکھیے اللہ والے ایسے ہوتے ہیں، جن سے گناہ تو درکنار، سنت بھی کبھی ترک نہیں ہوتی اور یہی اصل کرامت ہے۔

محبت و مخالفت جمع نہیں ہو سکتے

لہٰذا ولی اللہ وہی ہے، جو اللہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہو اور اگر اطاعت نہیں کرتا، تو یہ جھوٹا ہے، جیسا کہ حضرت رابعہ بصریہ نے فرمایا ہے۔

تَعْصِي الْإِلٰـهَ؟ وَأَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ ☆ هٰذَا لَعُمْرِيْ فِي الْقِيَاسِ بَدِيْعٌ

لَوْكَانَ حُبُّكَ صَادِقاً لَأَطَعْتَهُ ☆ إِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيعٌ

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور اللہ کی محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے؟ یہ بات نہایت عجیب ہے؛ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو، تو اس کی اطاعت کرتا؛ کیوں کہ چاہنے والا عاشق اپنے محبوب کا مطیع وفرماں بردار ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جسے کسی سے محبت ہوتی ہے، وہ اس کی مخالفت نہیں کرتا؛ کیوں کہ محبت کے ساتھ معصیت ومخالفت جمع نہیں ہوسکتی ؛ بل کہ اطاعت شعاری وفرماں برداری، محبت کے لوازمات میں سے ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [آل عمران: ۳۱]

(اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو، تو میری اتباع کرو، پس اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے اس کی اطاعت وفرماں برداری ضروری ہے؛ مگر چوں کہ رسول کی اتباع میں اللہ کی اطاعت مضمر (چھپی ہوئی) ہے؛ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اتباع کرو۔ اسی وجہ سے بعض حضرات سلف نے محبت کی تعریف ہی اطاعت سے فرمائی ہے۔

چناں چہ امام زہری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ اللہ سے اور رسول سے محبت یہ ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت اور ان کے احکام کی اتباع کی جائے۔

(تفسير قرطبي: ۴/۶۰)

اور ابن حجر رَحِمَہُ اللّٰہُ نے شیخ محی الدین رَحِمَہُ اللّٰہُ سے نقل کیا کہ اللہ سے محبت، اس کی اطاعت اور ترکِ مخالفت سے حاصل ہوتی ہے۔ (فتح الباري: ۱/۶۱)

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اگر بندے کو محبت ہے، تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس کی مخالفت اور معصیت نہ کرے، یہ اصلِ عظیم ہے، اس کو یاد رکھنا چاہیے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ میں جذبۂ اطاعت

امام ابوداوٗد رحمہ اللہ نے ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کا عجیب واقعہ بیان کیا ہے، جو ان کے عشقِ رسول پر دلیل ہونے کے ساتھ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اصلِ محبت وعشق وہی ہے، جس میں اطاعت وفرماں برداری ہو اور مخالفت ونافرمانی نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے، تو راستے میں ایک بلند قبہ بنا ہوا دیکھا اور صحابہ کرام سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ یہ قبہ فلاں انصاری شخص کا ہے، حضو صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش ہو گئے؛ پھر وہ انصاری صحابی جن کا وہ مکان تھا، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا، تو آپ نے منہ پھیر لیا اور کئی دفعہ ایسا ہی کیا، اس سے ان صحابی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ناراض ہونا معلوم ہوا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معاملہ پوچھا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارا قبہ دیکھا تھا، یہ سن کر صحابی نے سمجھا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی قبے کے بنانے سے ناراض ہیں اور واپس گئے اور اپنا مکان منہدم کر دیا اور زمین کے برابر کر دیا؛ پھر کسی وقت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف سے گزرے اور اس قبے کو نہ پا کر سوال کیا کہ قبہ کیا ہوا؟ تب صحابہ نے پورا واقعہ آپ کو سنایا۔ (ابو داود: ۲/۷۱۱، حدیث: ۵۲۳۷)

یہ ہے سچی محبت اور سچا عشق کہ محبوب کی اتباع واطاعت کرنے کی دُھن اور فکر لگی رہے اور اس کو ناراض کرنے والی ادنیٰ سی حرکت بھی گوارا نہ کرے اور جیسے اللہ

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے لیے آپ کی اطاعت لازم ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے بھی لازم ہے۔

اطاعت کے دو درجے

فرمایا کہ اطاعت کے دو درجے ہیں: ایک ہے فرض درجہ اور ایک ہے نفل۔ فرائض کا درجہ نوافل سے بڑھا ہوا ہے، جب آدمی اللہ کی محبت حاصل کرنا چاہے، قربت حاصل کرنا چاہے، تو اللہ کی محبت وقربت کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ فرائض کو پوری پابندی کے ساتھ ادا کرے۔ فرائض کیا ہیں؟ یہ دو کام ہیں: ایک تو یہ کہ جتنے کام اللہ نے ضروری قرار دیے ہیں، ان سب کو ادا کرے، دوسرے یہ کہ جتنے کاموں سے بچنے کو ضروری قرار دیا ہے ان سے بچے، جب اس طرح تمام فرائض پر پوری طرح پابندی کرے گا، تو ایک درجہ اس کا پار ہو جائے گا، اس کے بعد دوسرا درجہ نوافل کا ہے، جس سے بندہ اللہ کے قریب سے قریب تر ہوتا رہتا ہے۔

حدیثِ قدسی میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ " مَنْ عَادیٰ لِيْ وَلِيّاً فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَیْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ" . (بخاري :٦١٣٧)

(اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے دوست سے عداوت رکھے، میں اس سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں اور بندہ کسی چیز سے جو مجھے پسند ہے میرے اتنا قریب نہیں ہوتا جتنا کہ فرائض سے، جو میں نے اس پر فرض کیے ہیں اور بندہ نوافل کے ذریعے برابر میرے قریب ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں۔)

پہلے فرائض ادا کرو اور قضا کا طریقہ

اگر آدمی فرائض ہی انجام نہیں دیا، تو آگے کا وہ کوئی درجہ پار نہیں کرسکتا، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا پہلا درجہ ہی پورا نہیں ہوتا، اگلے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، نمازیں ہی پوری نہیں ہوئیں، سر پر نمازوں کا بار ہے، اللہ کا قرض ذمے میں موجود ہے؛ لیکن باتیں بہت بڑی بڑی کرتا ہے، اگر آدمی کو اگلے مراحل طے کرنا ہے، تو سب سے پہلے چاہیے کہ نمازیں اپنی پوری کرے۔

اس لیے میں نے پہلے بھی بتایا کہ جن کے ذمے نمازیں باقی ہوں، وہ تھوڑی تھوڑی کر کے اپنے ذمے سے اس کو ادا کرتے رہیں، کم از کم ایک ادا نماز کے ساتھ ایک قضا نماز مزید پڑھ لے، کسی کی دس سال کی نمازیں باقی ہیں، کسی کی پانچ سال کی نمازیں باقی ہیں، کسی کی دو چار سال کی نماز باقی ہے، اس کو چاہیے کہ حساب لگائے، حساب لگانے کے بعد اس کو روزانہ ادا کرنا شروع کردے، اسی طرح کسے کے ذمے روزے باقی ہیں، تو روزوں کی قضا رکھے، بہت سارے لوگ ہیں، جو زکوٰۃ ہی ادا نہیں کرتے، کئی سالوں کی ان کے ذمے زکوٰۃ باقی ہے، ان کو چاہیے کہ حساب لگا کر زکوٰۃ ادا کریں۔

اس طرح جب فرائض کی ادائے گی ذمے سے اتر جائے گی، تو فرض کا درجہ مکمل ہوگا، اس کے بعد نوافل سے قربِ حق کا دوسرا درجہ وہ پاسکتے ہیں۔ بعض لوگ فرائض کے بغیر ہی نوافل کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ مسئلہ سن لیجیے کہ ”فرائض کے باقی ہوتے ہوئے نوافل پڑھنا جائز نہیں ہے“۔ فرائض کے پورا ہونے کے بعد نوافل کا نمبر ہے جس سے درجات بلند ہوتے ہیں، جیسا کہ ابھی آپ نے حدیث سنی کہ آدمی نوافل سے برابر اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا رہتا ہے۔

دوسری علامت-''رضا بالقضا''

محبت کی دوسری علامت یہ ہے کہ راحت ونعمت یا آفت ومصیبت جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے پیش آئے، اس پر بہ دل وجان راضی رہے، یہ نہیں کہ راحت ونعمت ملنے پر تو خوش ہوجائے اور آفت ومصیبت اور تنگی وپریشانی پیش آئے، تو واویلا مچائے اور اللہ کا شکوہ کرنے لگے، یہ بات محبت سے بہت دور ہے۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے جو بھی پیش آئے اس پر راضی رہے۔

حضرت محبوب سبحانی شیخ جیلانی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ایک وعظ میں فرمایا ہے کہ اے کذاب! تو نعمت کی حالت میں خدا کو محبوب سمجھتا ہے؛ لیکن جب بلا آتی ہے، تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے، گویا اللہ عزوجل تیرا محبوب نہیں تھا، بندہ تو آزمائش ہی کے وقت ظاہر ہوتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلائیں آئیں اور تو جما رہے، تو بے شک تو محبّ (عاشقِ خدا) ہے اور اگر تیری حالت میں تبدیلی آجائے، تو جھوٹ کھل گیا اور پہلا دعوائے محبت ٹوٹ گیا۔ (خطباتِ غوثیہ، مجلس نمبر:۱)

ایک اور بزرگ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے بڑی عجیب بات فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ "**حقيقة المحبة أن لا تزيد بالعطاء ولا تنقص بالجفاء**'' کہ محبت کی حقیقت یہ ہے کہ نہ عطا سے بڑھے اور نہ جفا سے گھٹے۔

(مرقاة: ۱/۷۵، فتح الباري ایضاً: ۱/۶۲)

مطلب یہ ہے کہ حقیقی محبت ایسی ہوتی ہے کہ محبوب کی طرف سے عطا ونوال اور بخشش ونوازش کا معاملہ ہو، تو کیا اور اس کی طرف سے کچھ (ظاہری طور پر) پریشانی و مصیبت پیش آئے، تو کیا، وہ ہر صورت میں برقرار رہتی ہے۔

محبت کو پرکھنے کا معیار

اور یہی اصلی محبت کو پرکھنے کا معیار ہے؛ چناں چہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوے اور عرض کیا کہ اے نبی اللہ! میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ دیکھ لو کیا کہتے ہو؟ انھوں نے پھر عرض کیا کہ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں، اسی طرح تین مرتبہ انھوں نے کہا۔ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اگر تم سچے ہو، تو فقر و فاقہ برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ؛ کیوں کہ فقر و فاقہ میرے چاہنے والوں کی طرف اس سے زیادہ جلدی آتا ہے، جتنا کہ سیلاب اپنی منزل کی طرف چلتا ہے۔

(ترمذي: ۲۳۵۰، مستدرک: ۳۶۷/۴، شعب الإیمان: ۱۷۳/۲)

ایک اور موقعے پر فرمایا کہ سب سے زیادہ سخت آزمائش انبیائے کرام علیہم السلام کی ہوتی ہے، پھر ان کی، جو ان سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد کا درجہ رکھتے ہیں۔ (ترمذي: ۲۳۹۸، سنن دارمي: ۴۱۲/۲، صحیح ابن حبان: ۱۶۰/۷، وغیرہ)

غرض! یہ کہ اللہ و رسول سے محبت کا دعویٰ تو سبھی کرتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ آزمائش کے موقعہ پر وہ کس قدر ثابت قدم رہتا ہے اور اس کو کس طرح خوش دلی سے برداشت کرتا ہے، اگر صبر و تحمل سے کام لیتا ہے اور شکوہ شکایت سے باز رہتا ہے اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہتا ہے، تو وہ واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہے، ورنہ وہ اپنے محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

مجھے حضرت شیخ جیلانی رَحِمَهُ اللّٰهُ کی بات یاد آتی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''اللہ و رسول کی محبت فقر و بلا کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اسی لیے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ بلا و مصیبت ولایت پر تعینات کر دی گئی ہے تا کہ ہر کوئی ولایت کا دعوی نہ کر سکے،

اگر ایسا نہ ہوتا، تو ہر شخص اللہ کی محبت کا دعویٰ کر بیٹھتا۔ پس بلا وفقر پر جمے رہنے کو اللہ ورسول کی محبت کے لیے علامت بنا دیا گیا ہے۔ (خطباتِ غوثیہ، مجلس نمبر:۱)

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیش آئے، خواہ جی چاہے یا نہ چاہے اس پر راضی وصابر رہے۔

رضا بالقضا کی لذت

یہ رضا بالقضا ایمان کا ایک حصہ ہے اور اسی کے ساتھ اس میں دنیا میں بھی ایک قسم کی حلاوت ولذت ملتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ایک شعر کہا ہے، جو بڑا جان دار وشان دار ہے، اس میں اس حقیقت کو سمجھا دیا ہے، کہتے ہیں:

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو، تو مزا دیکھ
دنیا ہی بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

واقعی جو شخص اللہ کی تقدیر پر راضی ہو جاتا ہے اور ہر خیر وشر کو اللہ کی طرف سے جانتا ہے اور اس میں اللہ کی حکمتوں کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ بڑے مزے میں ہوتا ہے، گویا اسے اس دنیا ہی میں جنت کا لطف ومزہ مل جاتا ہے۔

اور جب اس کو اس میں مزہ آتا ہے، تو وہ بزبانِ حال یوں کہتا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

کہ اے اللہ! کسی دشمن کو یہ بات نصیب نہ ہو کہ وہ آپ کے تیغ وخنجر سے ہلاک ہو؛ کیوں کہ ہم دوستوں کا سر سلامت ہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائیں۔

الحاصل! جو اللہ کا بندہ اللہ کی جانب سے پیش آنے والے حالات کو اللہ کی جانب سے سمجھتا ہے، اس کو اس میں مزہ آتا ہے اور اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ حالات ومصائب کسی کافر کو نہیں؛ بل کہ ہمیں ہی پیش آئیں کہ یہ ہمارے محبوب کی

طرف سے ہیں۔

آج کا دعویٔ محبت

اس تفصیل کے بعد ذرا اپنے اوپر بھی ایک نظر ڈالتے چلیے، آج بہت سے لوگ دعویٔ محبت تو کرتے ہیں؛ مگر محبت کی جو شرائط بیان کی گئی ہیں، ان میں سے بعض کے پاس تو ایک بھی نہیں ہوتی اور بعض کے پاس ایک ہوتی ہے، تو دوسری غائب ہوتی ہے۔ مثلاً: اطاعتِ خداوندی واطاعتِ رسول ہے، جو محبتِ الٰہی کی اولین شرط ہے۔ اسی طرح ان کی معصیت ونافرمانی سے بچنا کہ محبتِ الٰہی کے لیے یہ بھی لازم ہے؛ مگر بہت سے دعوے داران شرائط سے غافل ہی نہیں؛ بل کہ ان کے تارک بھی ہوتے ہیں کہ مستقل طور پر اللہ ورسول کی طاعت سے اعراض وروگردانی کرتے اور ان کی نافرمانی اور معصیت میں مبتلا رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ محبت وعشقِ خداوندی کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ عبادات میں غفلت وکوتاہی کی جاتی ہے، معاشرتی احکام کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اخلاقی قوانین سے بے التفاتی برتی جاتی ہے؛ جب کہ یہ ساری تعلیمات وتلقینات حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نازل فرمائی گئیں اور ہم سے مطالبہ کیا گیا کہ ان کی پیروی کرو؛ مگر پیروی کے بجائے بے راہ روی اختیار کی جاتی ہے، کیا یہ محبت کا تقاضا ہوسکتا ہے؟

اسی طرح اگر اللہ کی طرف سے کوئی بیماری، پریشانی، آفت ومصیبت پیش آتی ہے، تو واویلا مچایا جاتا ہے، اس کا شکوہ کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ ”نعوذ باللہ“ اللہ تعالیٰ کو گالیاں بھی دیتے ہیں۔ کوئی مرجائے، تو چیختے، چلاتے ہیں، ماتم کرتے ہیں، بے صبری کا پوری طرح مظاہرہ کرتے ہیں۔ کیا یہ اللہ سے محبت ہے؟ نہیں یہ تو خلاف محبت ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا صبر، وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نبی الثقلین سرورِ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر و نورِ نظر، جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا، تو ظاہر ہے کہ آپ کو بہت غم ہوگا، کس قدر غم ہوا ہوگا اس کا اندازہ ان کے ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے، جو انھوں نے اس موقعے پر فرمائے تھے ۔

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبُ لَوْ أَنَّهَا ☆ صُبَّتْ عَلَى الْأَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

(فرماتی ہیں کہ مجھ پر اللہ کے رسول کی وفات کی وجہ سے جو مصائب ڈالے گئے ہیں، وہ اگر دنوں پر ڈال دیے جائیں، تو دن رات ہو جائیں)

یعنی دن کی روشنی ان مصائب کا تحمل نہ کر سکے گی اور دن بھی اندھیریوں میں تبدیل ہو جائیں جیسے راتیں ہوتی ہیں۔

اندازہ کیجیے کہ کس قدر غم ہوگا؛ مگر کوئی شکوہ وشکایت ان کی زبان پر نہ جاری ہوا۔ آج عورتیں اپنے کسی رشتہ دار باپ، ماں یا شوہر کے یا کسی اور کے انتقال پر نہایت ہی بے صبری کا مظاہرہ کرتی اور شکوہ و شکایت کی زبان دراز کرتی نظر آتی ہیں۔ یاد رکھو! یہ محبتِ الٰہیہ کے خلاف ہے۔

محبتِ حق پیدا کرنے کا طریقہ ”ذکرِ حق“

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوگا کہ ہمارے دل کے اندر اللہ کی محبت سمائے؟ اس کا کیا طریقہ ہے کہ ہم بھی اللہ کی محبت میں چور ہو جائیں؟ علما وصوفیا نے اس کے لیے چند اصول وطریقے بیان کیے ہیں۔

اس میں سب سے اعلیٰ اور سب سے اہم ترین طریقہ یہ ہے کہ اللہ کا ذکر کیا

جائے ،جس قدر اللہ کا ذکر ہوگا، اللہ کی محبت دل میں سمائے گی، گھس جائے گی، رچ جائے گی، بس جائے گی۔

چناں چہ ایک حدیث میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:"**يقول الله أنا عند ظن عبدي بي وأنا معه إذا ذكرني في ملإ ذكرته في ملإٍ خير منهم ، وإن تقرب إليّ شبرًا تقربت إليه ذراعاً ، وإن تقرب إلي ذراعاً تقربت إليه باعاً، وإن أتاني يمشي أتيته هرولةً. (مسلم:۲۶۷۵)**

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں میرے بندے کے گمان کے قریب ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، جب وہ مجھے کسی مجمع میں یاد کرتا ہے،تو میں اس سے بہتر مجمع میں اس کو یاد کرتا ہوں اور اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے،تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو جاتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے،تو میں دو ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میرے پاس چل کر آتا ہے،تو میں دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہوں)

بھائیو! اس حدیث سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ یہ کہ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے،تو وہ اللہ کی قربت اور اللہ کی محبت پاتا ہے اور جب بندے کو اللہ کی محبت ملتی ہے،تو اس کے دل میں بھی اللہ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے؛ کیوں کہ جب اللہ ہم کو چاہے،تو ضرور ہم بھی اللہ کو چاہیں گے۔

ذکر سے مذکور تک

حضرت مولانا عبد الغنی پھول پوری رَحِمَهُ اللهُ حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَهُ اللهُ کے ایک جلیل القدر وعظیم المرتبت خلیفہ گزرے ہیں،ان کی ایک بات یاد آئی،آپ فرماتے تھے کہ ''ذکر'' ذاکر کو مذکور تک پہنچا دیتا ہے۔

ذکر معلوم ہے اور ذاکر بھی معلوم ہے، مذکور کون ہے؟ مذکور اللہ کی ذات ہے،

جب کوئی بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو یہ ذکر اس کو اللہ تک پہنچا دیتا ہے۔ کس قدر عظیم خوش خبری ہے ذاکرین کے لیے! کہ وہ اللہ تک رسائی پا جانے والے ہیں، اس سے بڑی کیا نعمت چاہیے؟

بعض سالکین کی ایک غلطی پر تنبیہ

یہیں سے ان سالکین کی غلطی معلوم ہوگئی، جو ذکر کی توفیق ملنے کے باوجود یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم ذکر تو کر رہے ہیں؛ مگر کوئی فائدہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ اے سالکین! یہ بہت بڑی غلطی ہے، جب اللہ نے آپ کو ذکر کی توفیق عطا فرمائی ہے، تو یہ خود بہت بڑی اور عظیم الشان نعمت ہے، اگر اس کے بعد اور کچھ بھی نہ ملے، تو بھی آپ کو بہت کچھ مل گیا۔ اس کے علاوہ قرآن وحدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو خود اللہ تعالیٰ بھی بندے کو یاد کرتے ہیں، جیسے ابھی میں نے حدیث سنائی تھی اور قرآن میں بھی یہ بات ہے؛ چناں چہ فرمایا کہ " فَاذْكُرُوْنِيْ أَذْكُرْكُمْ " کہ تم مجھے یاد کرو، میں تم کو یاد کروں گا۔ اس سے بھی بڑی کیا چیز چاہیے کہ اللہ ہمیں یاد فرمائیں؟ اگر کوئی ہمیں بتائے کہ وزیر اعظم یا چیف منسٹر نے ہمیں یاد کیا، تو ہماری حالت کیا ہوتی ہے، کس قدر خوشی وفخر محسوس ہوتا ہے؟ جب کہ یہ سب ہم ہی جیسے بندے اور مخلوق ہیں، اگر ہمیں اللہ تعالیٰ یاد کریں، تو بتاؤ اس سے بڑی کیا نعمت ہو سکتی ہے؟

ایک صاحب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے پاس آئے اور یہی شکایت کرنے لگے کہ میں ذکر تو کرتا ہوں؛ مگر مجھے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے، حضرت حاجی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے جو کہ اس راہ کے رہبر ہیں، انھوں نے فرمایا کہ تم اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتے ہو کہ اللہ نے تم کو اپنے پاک نام کے لینے کی توفیق دے دی،

یہ کیا کچھ کم ہے؟

کیا ہمارے پاس ذکر کرنے کے لیے وقت نہیں؟

بہت سارے لوگ ذکر شروع کرتے ہیں؛ لیکن پابندی نہیں کرتے، کوئی آٹھ دن تک کیا، اس کے بعد چھوڑ دیا، کوئی دس دن کیا، اس کے بعد چھوڑ دیا، کوئی ایک مہینہ دو مہینے کیا، اس کے بعد چھوڑ دیا، مصروفیات اور مختلف قسم کی مشغولیات کا بہانہ سامنے آتا رہتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بہانے اور عذر بالکل بے کار اور فضول ہیں۔کل بھی میں ایک صاحب سے کہہ رہا تھا کہ اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دو فہرستیں تیار کیجیے: ایک فہرست ان اعمال کی اور مصروفیات کی، جو ہمارے لیے ضروری ہیں، دوسری فہرست ان اعمال کی اور مصروفیات کی، جو غیر ضروری ہیں، صبح سے لے کر شام تک جو اعمال ہم سے صادر ہوتے ہیں، اس پر غور کریں کہ میں صبح اٹھا، اس کے بعد یہ کام کیا، اس کے بعد یہ کام کیا، شام تک کا حساب لگائیے، ایک خانے میں ان چیزوں کو لکھتا جائے، جن کو ضروری سمجھتا ہے اور دوسرے خانے میں ان اعمال کو لکھتا جائے، جو غیر ضروری ہیں۔اب اس کے بعد یہ دیکھے کہ کونسی فہرست لمبی ہے، میرا اپنا خیال یہ ہے، اندازہ یہ ہے کہ ہماری وہ فہرست بڑی لمبی چوڑی نکلے گی، جو غیر ضروری چیزوں پر مشتمل ہے، فضولیات پر مشتمل ہے؛ کیوں کہ ہمارے پاس بے کار دھندے اور خواہ مخواہ کی بات چیت اور فضول کاموں کا ایک طویل سلسلہ ہے؛ بل کہ گناہوں کا سلسلہ بھی ہے، کہیں غیبتیں ہیں، کہیں چغلیاں ہیں، کہیں بہتان تراشیاں ہیں، کہیں اِدھر اُدھر کی بکواس ہے، اس طرح کی بہت ساری چیزیں اس میں ملیں گی۔اور جو انتہائی ضروری کام ہیں، ان کی فہرست بہت مختصر ہوگی؛ کیوں کہ

ہم ضروری کام تو کرتے ہی نہیں، تو آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کی مشغولیت کا جو آپ بہانہ بناتے ہیں یہ غلط ہے۔

جب آدمی کہتا ہے کہ اتنا مصروف ہوں، اتنا مصروف ہوں کہ ذکر نہیں کر سکتا، بڑی شرم کی بات ہے، کیا ذکر اللہ سے بھی بڑھ کر کوئی ضروری کام ہے؟ کیا اللہ کے ذکر سے بھی بڑھ کر مؤمن کی کوئی مشغولیت ہو سکتی ہے؟ دوکان سے بڑھ کر، مکان سے بڑھ کر اور دنیا و مافیہا سے بڑھ کر کیا اللہ کی ذات نہیں ہے؟

جب ہم ان سب چیزوں کو وقت دینے کے لیے تیار ہیں، تو پھر اللہ کے ذکر کے لیے ہمارے پاس وقت کیوں نہیں؟ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہانہ بالکل فضول قسم کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس بہت وقت ہے، اللہ تعالیٰ نے بے شمار وقت ہم کو دیا ہے۔

دنیا کے مشغلے ذکر میں رکاوٹ بنیں، تو کیا کریں؟

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ وقت ہمارے پاس کم ہے اور ہم وقت نہیں نکال پا رہے ہیں اور اس وقت میں کچھ بھی نہیں کر سکتے، تو ایک بات عرض کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہمارا خیال ہے، تو پھر ہم کو ساری دنیا کی مصروفیتوں کو چھوڑ کر صرف ذکر کو پکڑ لینا چاہیے، اس لیے کہ جب دنیا کے مشغلے اللہ کے ذکر میں رکاوٹ بن رہے ہیں، تو ان سب کو چھوڑ کر بس ذکر ہی کرے آدمی۔ ایک شاعر نے کہا ؎

إذَا كُنْتُ أَعلم عِلماً يَقِيناً ☆ بأنَّ جميعَ حَياتِيْ كَسَاعَه

فلِمَ لا أ كُونُ ضَنِيناً بِهَا ☆ وَأَجعلُهَا فی صَلاح وَ طَاعَه

(یعنی شاعر کہتا ہے کہ جب میں یقینی طور پر اچھی طرح یہ جانتا ہوں کہ میری پوری زندگی ایک گھنٹے کے برابر ہے، تو پھر میں کیوں نہ بخیل بن جاؤں اپنی اس

زندگی کے بارے میں، اپنے وقت کے بارے میں کہ میں بخیلی کرتے ہوئے، کنجوسی برتتے ہوئے، اس پورے وقت کو نیکی و طاعت میں کیوں نہ لگا دوں؟)

ارے! جب وہ جانتا ہے کہ اور کچھ وقت نہیں مل رہا ہے، تو اسے یہی چاہیے کہ اللہ کے ذکر میں لگ جائے، اللہ کی طاعت میں لگ جائے اور بس پوری زندگی اسی کے لیے وقف کر دے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

فضول گفتگو سے بچنے کی تدبیر-مولانا میاں صاحب رحمہ اللہ کا واقعہ

ایک بزرگ تھے دیوبند میں، جن کا نام ہے" حضرت مولانا میاں صاحب" رحمہ اللہ دار العلوم دیوبند کے محدث تھے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے بھی اساتذہ میں سے ہیں، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ان کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ ان کی مجلس ہوتی تھی اور اس میں علما، صلحا اور طلبا سب جمع ہوتے تھے اور کوئی مسئلہ پوچھتا، کوئی مشورہ لیتا، حضرت کبھی کچھ بیان فرماتے اور کبھی مسائل کی تحقیق ہوتی، مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہتیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت نے فرمایا کہ بھائی کل سے ہماری مجلس میں گفتگو صرف عربی زبان میں ہوگی، اردو میں نہیں، اس کے بعد مجلس برخاست ہو گئی اور لوگ چلے گئے، دوسرا دن ہوا تو، لوگ آئے، آنے کے بعد سب خاموش بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی بولتا نہیں، کوئی کچھ پوچھتا ہی نہیں، اگرچہ وہ علما تھے، طلبا تھے؛ لیکن عام طور پر عربی زبان میں گفتگو کی مشق چوں کہ نہیں ہوتی ہے، تو وہ جیسے اردو سرسر بول لیتے ہیں، اس طرح نہیں بول پاتے اور سب کے سب خاموش بیٹھے ہوئے ہیں، بہت دیر کے بعد کسی نے کہا کہ حضرت ایک مسئلہ ہے، عربی میں اس نے ایک جملہ بہت ہی جچا، تُلا استعمال کیا۔ اب

حضرت نے اس کا جچا تلا عربی میں جواب دیا؛ پھر مجلس پر خاموشی طاری ہوگئی؛ پھر کچھ دیر کے بعد کسی نے سوال کیا؛ پھر اسی طرح جواب ہوگیا؛ پھر خاموشی طاری ہوگئی، دو چار ہی باتیں ہوئیں تھیں کہ عصر سے مغرب تک کا وقت ختم ہوگیا اور لوگ چلے گئے۔

دوسرا دن ہوا وہی کیفیت، تیسرا دن ہوا وہی کیفیت، کوئی کچھ بولتا ہی نہیں، دو تین دن کے بعد کسی نے حضرت سے سوال کیا کہ حضرت! آپ نے یہ عربی والی قید لگا کر ہم لوگوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا اور استفادے کا دروازہ بند کردیا، افادے کا دروازہ بند ہوگیا ہے، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو حضرت نے فرمایا کہ بھائی! میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ایک چھوٹی سی بات ہوتی ہے؛ لیکن اس چھوٹی سی بات کے لیے بہت سے فضول الفاظ استعمال کرتے ہیں، پانچ لفظوں میں جو بات پوری ہوسکتی ہے ،اس کے لیے دس لفظ استعمال کرتے ہیں، جو بات دس لفظوں میں پوری ہوسکتی ہے، اس کے لیے چالیس، پچاس لفظ استعمال کرتے ہیں، وہ سب فضول ہوتے ہیں؛ اس لیے میں نے سوچا کہ ہماری اتنی عمریں ہوچکی ہیں، میری عمر پچاس ہوگئی ہے، کسی کی عمر چالیس ہوگئی، کسی کی عمر پینتالیس ہوگئی، کسی کی عمر بیس ہوگئی ہے۔ اور لوگ لمبی لمبی گفتگو کر کے اپنا وقت برباد کرتے ہیں، میں نے سوچا کہ یہ فضول گوئی میں جو وقت گزر رہا ہے، اس سے ان لوگوں کو بچاؤں، اس لیے میں نے یہ قید لگادی کہ عربی میں بولو، اب عربی میں بولے گا تو جچے تلے الفاظ میں بولے گا، بے کار کوئی لفظ استعمال نہیں کرے گا؛ جیسے اردو میں آدمی بکواس کرلیتا ہے، اس لیے وہاں بڑا سوچ سمجھ کر بولے گا، ضرورت ہی کا لفظ بولے گا؛ بل کہ جتنا ضروری ہے، وہ بھی پورا نہیں بول سکے گا، اس میں بھی کچھ گھٹ ہی جائے گا؛ اس لیے میں نے یہ قید لگائی ہے۔

بھائیو! یہ تھی ہمارے بزرگوں کی نظر کہ ہمارا وقت خراب نہ ہو اور اس وقت کو بچا بچا کر رکھے، اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے سامان تیار کیا جائے، اللہ تعالیٰ کے عشق کو دل میں بسانے کے لیے تدبیریں کی جائیں اور وہ سارا وقت اسی کے لیے صرف ہو جائے۔

عمر گھٹتی ہے یا بڑھتی ہے؟

اور لوگ کہتے ہیں کہ ہماری عمر بڑھ گئی، بڑھ کہاں گئی؟ درحقیقت گھٹ گئی، دراصل جتنی عمر لے کر آدمی آیا تھا اس سے گھٹ گئی، جب بچہ پیدا ہوا، تو وہ مثال کے طور پر پچاس سال کی عمر لے کر آیا، یا کوئی ستر برس کی عمر لے کر آیا اور ہر ایک سال گزرنے کے بعد اس کا برتھ ڈے (BIRTH DAY) منایا جاتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ ایک سال کا بڑا ہو گیا؛ حالاں کہ یہ بے وقوفی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا، اس کی لائی ہوئی عمر میں سے ایک سال کا گھٹ گیا ہے۔

ایک عربی شاعر نے ایک عجیب شعر کہا ہے ؎

یَسُرُّ الْمَرْءَ مَاذَهَبَ اللَّيَالِي ☆ وَ كَانَ ذَهَابُهُنَّ لَهٗ ذَهَاباً

کہتا ہے کہ آدمی کو یہ بات بہت خوش کرتی ہے کہ اتنی راتیں گزر گئیں اور اتنے دن گزر گئے، ایک سال گزر گیا، دو سال گزر گئے، تین سال میرے گزر گئے، میں اتنا بڑا ہو گیا؛ حالاں کہ ان کا گزرنا تو خود اس کا گزر جانا ہے، یہ ایام اور راتیں گزرتی ہیں، تو حقیقت میں یہ خود بھی گزرتا رہتا ہے۔

جب یہ راتیں اور دن گزرتے ہیں، تو یہ کہتا ہے کہ میں اتنا بڑا ہو گیا؛ حالاں کہ اور گھٹ گیا اور گھٹتے گھٹتے ایک دن تو وہ پوری طرح گھٹ ہی جائے گا؛ بل کہ مر ہی جائے گا، اور قبر میں دفن ہو جائے گا اور یہ سمجھ رہا ہے کہ میں بڑھ رہا ہوں؛ حالاں کہ گھٹتا جا رہا ہے۔ احقر کا اس پر ایک شعری قطعہ سن لیجیے:

بجلی کی طرح تیز گزرتے دیکھا ☆ اور مثلِ برف ہم نے پگھلتے دیکھا
کہتا ہے زمانہ عمر بڑھتی ہے شعیبؔ ☆ ہم نے تو ہمیشہ اِسے گھٹتے دیکھا

تو میں کہہ رہا تھا کہ اللہ کا ذکر سب سے زیادہ اہم ترین چیز ہے؛ لہٰذا اللہ کا ذکر شروع کیجیے، ذکر مقصودِ اعظم ہے۔

کیا آپ ﷺ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتے تھے؟ ایک علمی افادہ

اللہ کے نبی ﷺ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے "إن النبي ﷺ كان يذكر اللّٰهَ على كُلِّ أحيانِه "(اللہ کے نبی ﷺ تمام اوقات میں اللہ کے ذاکر تھے) کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرتے ہوں۔ (مسلم: ۳۷۳)

علما نے لکھا ہے کہ اس سے وہ وقت مستثنیٰ ہے، جو استنجے کے لیے ہوتا ہے، اس لیے کہ استنجا خانے میں جب جاتے ہیں، تو وہاں پر ذکر اللہ منع ہے؛ لیکن باقی اوقات سب کے سب ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔

لیکن میرے ذہن میں اس سلسلے میں ایک لطیف بات آتی ہے، وہ یہ کہ جو اللہ تعالیٰ کا ذکر بیت الخلا کے موقعے پر منع ہے، وہ اس لیے ہے کہ آدمی جب بیت الخلا جاتا ہے، تو اس سے گندگی خارج ہوتی ہے اور وہ ناپاک ہو جاتا ہے اور گندگی میں تلوث کی وجہ سے ہم اس قابل نہیں رہتے کہ اللہ تعالیٰ کا وہاں پر نام لیں؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اکثر و بیشتر علما کی رائے ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا فُضلہ بھی پاک تھا، تو اللہ کے نبی ﷺ سے جو خارج ہوتا تھا، وہ فضلہ پاک تھا تو آپ کو تلوث بالنجاست نہیں ہوتا تھا اور جب تلوث بالنجاست نہیں، تو آپ کے لیے بیت الخلا میں اللہ کا ذکر ممنوع نہیں، ممنوع

توان کے لیے ہے، جوملوث ہوتے ہیں نجاست کے ساتھ اور جن سے خروج ہوتا ہے نجاست کا اور جب نجاست کا خروج ہی وہاں پر نہیں، تلوث بالنجاست نہیں، تو آپ کے لیے ممنوع نہیں؛ اس لیے اگر اس حدیث " إن النبي صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کان یذکر اللّٰه علی کل أحیانه "(اللہ کے نبی صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تمام اوقات میں اللہ کے ذاکر تھے) کو اپنے پورے عموم پر رکھ لیا جائے، تو کوئی اعتراض نہیں، استثنا کی کوئی ضرورت نہیں۔ واللّٰه تعالیٰ أعلم

بہر حال! ایک رائے کی بات ہے، رائے تو بھائی! کبھی رائی کے برابر ہوتی ہے، اور کبھی پائی کے برابر ہوتی ہے، اب یہ رائی کے برابر ہو، تو ٹھکرا دیجیے، نہیں تو قبول کر لیجیے، اگر صحیح ہو، تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے اور اس کے شر سے ہماری حفاظت فرمائے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جب کوئی رائے پیش کرتے تھے، تو اس وقت یہ فرماتے تھے کہ اگر یہ صواب (درست) ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اگر اس میں کوئی خطا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے۔

بہر حال! یہ تو ضمنی بات تھی، دراصل یہ کہنا تھا کہ نبی اکرم صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہر وقت ذکر اللہ میں رہتے تھے۔

ذکر کا دوسرا طریقہ

ذکر اللہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی بیٹھ کر اللہ کو یاد کرے، خاص وقت میں اور دوسرا طریقہ اس کا یہ ہے کہ چلتے ہوئے، پھرتے ہوئے، مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور اس کی ایک تدبیر یہ ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ان دعاؤں کے پڑھنے کا اہتمام کرے، جو اللہ کے نبی صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مختلف

اوقات کی ہم کو تعلیم دی ہے، کھاتے وقت کی دعا ہے، پیتے وقت کی دعا ہے، کھانا ختم کرتے وقت کی دعا ہے، کھانے کے درمیان کی دعا ہے، بیت الخلا جانے کی دعا ہے، بیت الخلا سے آنے کی دعا ہے، گھر سے باہر نکلنے کی دعا ہے، گھر میں داخلے کی دعا ہے، سونے کی دعا ہے، اٹھنے کی دعا ہے اور بعض ایسی دعائیں، جس میں ہم اپنے گناہوں سے استغفار کے ذریعے اللہ کو یاد کر سکتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

" يا أَيُّهَا الناسُ! تُوبُوا إلى اللّٰهِ ، فَإِنِّي أَتُوبُ إِلَيْهِ كُلَّ يوم مِائة مرةً " (اے اللہ کے بندو! اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرو؛ کیوں کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی جناب میں ایک دن میں سو، سو دفعہ توبہ کرتا ہوں)۔ (مسلم : ۲۷۰۲)

تو یہ توبہ بھی اللہ کا ذکر ہے اور زندگی کے تمام اوقات میں دعائیں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، اگر ان اوقات کی دعاؤں کو یاد کیا جائے اور وقت، وقت پر ان کو پڑھ لیا جائے، تو ہمارا پورا وقت ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے گا۔

کتنی آسان تدبیر ہے؟ بہترین تدبیر ہے؟ ان دعاؤں میں کہیں وہ ذکر، اللہ تعالیٰ کی یاد کے طور پر ہے اور کہیں وہ ذکر، اللہ کے شکر کے طور پر ہے اور کہیں وہ ذکر، طلب اور دعا کے عنوان سے ہے؛ لیکن کسی نہ کسی طور پر اللہ کا ذکر ہوتا رہتا ہے؛ لہٰذا آدمی کو جو دنیوی کام کرنا ہے، وہ بھی کرے اور اس کے ساتھ ذکر بھی کرے، تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی؛ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اس طرح لگنا چاہیے۔ اور اس ذکر کا حاصل اور خلاصہ اور اس ذکر کا نتیجہ اور ثمرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو جاتی ہے، اس لیے کہ جو آدمی جس کا ذکر زیادہ کرتا ہے، اس سے محبت ہو جاتی ہے اور جس آدمی کو جس سے زیادہ محبت ہوتی ہے، وہ اس کا زیادہ ذکر بھی کرتا ہے، یہ

لازم ملزوم چیزیں ہیں؛ اگر محبت نہیں ہے ذکر شروع کر دو، محبت آجائے گی اور اگر محبت پہلے سے موجود ہے، تو پھر بھی آدمی اسی کا ذکر بار بار کرتا رہتا ہے، ذکر وہ چیز ہے!!۔

حصولِ محبت کا دوسرا طریقہ-''نعمتوں میں غور وفکر''

بات شروع کی تھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کے طریقے کے متعلق کہ وہ کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے، تو میں نے ایک طریقہ یہ بیان کیا کہ اس کا طریقہ اللہ کا ذکر ہے۔اور اللہ کی محبت پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کرنا ہے یہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ کی بے شمار نعمتیں ہیں، ایسی ایسی نعمتیں ہیں، جن کی کوئی انتہا نہیں ہے،کوئی حد نہیں ہے، عجیب وغریب نعمتیں ہیں، ان نعمتوں پر غور کیا جائے۔

اللہ نے جگہ جگہ قرآن میں اپنی نعمتوں میں غور فکر کی دعوت دی ہے کہ زمین کو دیکھو، آسمان کو دیکھو، سورج کو دیکھو، چاند کو دیکھو، ہماری اس نعمت کو دیکھو، ہماری اُس نعمت کو دیکھو، کہیں سمندر کا ذکر ہے، کہیں ستاروں کا ذکر ہے اور کہیں پھلوں اور پھولوں کا ذکر ہے اور کہیں خود انسان کے اندر کی چیزوں کا ذکر ہے، ان سب چیزوں میں غور وفکر کیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کر دیتا ہے اور ان شاء اللہ اس سے اللہ تعالیٰ سے بے حد محبت پیدا ہو جائے گی۔

جب باپ سے اس لیے محبت ہے کہ وہ ہمیں نعمتیں دیتا ہے، ہماری رکھوالی کرتا ہے، ہماری نگہہ بانی کرتا ہے، ہماری تربیت وکفالت کرتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کریں گے، تو کیا اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں پیدا ہوگی؟ ضرور پیدا ہو جائے گی، اس لیے کچھ دیر آدمی کو چاہیے کہ اللہ کی محبت کی نیت سے غور وفکر کرے ان نعمتوں میں، کبھی کسی نعمت میں کر لے، تو کبھی کسی اور نعمت میں کر لے۔

امام غزالی رحمہ اللہ کی ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے ''رموزِ کائنات''
انھوں نے اس میں اس کائنات کی مختلف چیزوں کے اسرار بیان کیے ہیں، زمین اللہ نے کیوں پیدا کی؟ اس کی کیا خصوصیات ہیں؟ اس کے اندر کیا حکمتیں ہیں؟ اس کے اندر کیسی عجیب وغریب چیزیں ہیں۔ آسمان کو بنایا تو اس میں کیا کیا ہے؟ سورج میں کیا ہے؟ چاند میں کیا ہے؟ اگر وہ کتاب ملے، تو اس کو پڑھ لیجیے، پڑھنے کے بعد غور و فکر شروع کر دیجیے۔

کتنی محنتوں کے بعد ایک لقمہ تیار ہوتا ہے!

ایک بات عرض کرتا ہوں کہ آپ کے سامنے کھانے کا ایک لقمہ آئے، روٹی کا ایک نوالہ آئے، چاول کا ایک دانہ آئے، تو آپ اس پر غور کرنا شروع کر دیں کہ یہ دانہ کیسے پیدا ہوتا ہے، اس کے اوپر کیسی کیسی محنتیں ہوئی ہیں، اللہ کے فرشتوں نے اس پر کام کیا، اللہ کی ہواؤں نے اس پر کام کیا، اللہ کے سورج نے اس پر کام کیا، اللہ کے بنائے ہوئے انسانوں نے اس پر کام کیا، اس کے اوپر جانوروں نے کام کیا، اس کے اوپر نہ معلوم اور کتنی مخلوقات نے کام کیا ہے۔ ان ساری مخلوقات کے کام کرنے کے بعد وہ چیز پیدا ہوئی اور پیدا ہو کر جب سامنے آئی، پھر اس کی کٹائی ہوئی، کاٹنے والے کچھ لوگ تھے، پھر اس کی صفائی ہوئی، صفائی کرنے والے دوسرے لوگ تھے، پھر اس کے بعد بٹائی ہوئی، بٹائی کرنے والے تیسرے قسم کے لوگ تھے، پھر وہاں سے کہیں اور بازار میں آیا، اس کو خریدنے والے کوئی اور لوگ تھے، پھر وہاں سے دوکانوں میں اور اپنے اپنے محلوں میں آیا، وہاں پر لانے والے کچھ اور لوگ تھے، پھر وہاں سے ہم نے خریدا اور پھر ہمارے گھروں میں وہ دانہ آیا، پھر عورتوں نے اس کو پکایا اور اس کے بعد ہمارے سامنے آیا تو مزے دار لقمہ بن کر آیا۔

غور فرمایا جائے کہ ایک نوالے کے لیے اتنی مخلوقات کو خدا نے لگا دیا اور مسخر کردیا کہ یہ کام کریں؛ ہواؤں کو مسخر کیا، سورج کو مسخر کیا اور جانوروں کو مسخر کیا، فرشتوں کو مسخر کیا اور انسانوں کو مسخر کیا اور ان سب کی محنتوں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے یہ چیز ہمارے سامنے لائی ہے اور ہم اس کو مزے لے کر کھاتے ہیں، غور کرو کہ ہمارے خالق نے ایک دانہ ہم تک پہنچانے کے لیے کتنی مخلوقات کو اس کے پیچھے لگا دیا اور ہم ہیں کہ بغیر غور وفکر کیے اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں، کیا ان میں غور وفکر کرنے سے اللہ کی محبت پیدا نہیں ہوگی؟ ضرور پیدا ہوگی!۔

کھانے کا عجیب نظامِ قدرت

اللہ کی نعمتوں میں سے ایک چیز پر غور کیجیے!، وہ یہ کہ جب ہم کھانا کھاتے ہیں، تو کھانا حلق کے ذریعے اندر جاتا ہے، اس کا بھی اللہ نے عجیب نظام بنایا ہے، اللہ نے حلق میں دو نالیاں آگے پیچھے بنائی ہیں، سامنے ایک نالی ہے اور اس کے پیچھے دوسری نالی ہے، پیچھے کی نالی کھانے، پینے کے لیے ہے، اس سے کھانا، پانی اندر جاتا ہے اور سامنے کی جو نالی ہے، وہ سانس کی نالی ہے، یہ نالیاں بازو بازو نہیں؛ بل کہ آگے پیچھے بنائی گئی ہیں اور اس سانس کی نالی میں ایک قطرہ پانی چلا جائے، تو آدمی کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ وہ قطرہ خطرہ بن جائے گا، ایک دانہ اگر اس کے اندر گھس جائے، سانس رک جائے گی اور آدمی کا دم گھٹ جائے گا، ہوسکتا ہے کہ اس کا نتیجہ موت ہو، اسی سامنے کی نالی کو پار کر کے کھانا پیچھے کی نالی میں جانا ہے۔ اب ذرا غور کیجیے کہ اللہ نے اس کے لیے کیا طریقہ رکھا ہے؟ حلق کے سامنے ایک چھوٹی سی جیب لگا رکھی ہے، جب آدمی لقمہ منہ کے اندر رکھتا ہے اور حلق میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ جیب سامنے والی نالی پر پل کی طرح پڑ جاتی ہے اور اس کو بند کر

دیتی ہے اور وہ لقمہ اس پل کے اوپر سے پار ہو کر حلق کے اندر داخل ہوتا ہے۔

اب تھوڑی دیر اس پر غور کیجیے کہ ہمارا وہ خالق کیسا ہوگا؟ ہمارا وہ مالک کیسا ہوگا؟ جس نے ایسا عجیب وغریب نظام ہماری حفاظت کا بنایا، جس میں خطرہ ہی خطرہ ہے، یہ غذا ہی ہماری بقا کا ذریعہ ہے؛ لیکن خطرے سے دو چار ہے؛ حالاں کہ اگر اللہ چاہتے، تو کیا ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ سامنے کی نالی کو پیچھے اور پیچھے کی نالی کو سامنے کر دیتے، تو سامنے کی نالی سے کھانا آسانی سے پار ہو جاتا، پیچھے کی نالی اندر سے سانس کے لیے رکھ دی جاتی، اس میں کوئی خطرے کی بات نہ تھی اور ایسا کرنا اللہ کو کیا مشکل تھا؟ جو اللہ سانس کی نالی کو سامنے اور لقمہ جانے کی نالی کو پیچھے رکھ سکتا ہے، وہ اللہ اس کا برعکس بھی تو کر سکتا ہے؛ لیکن اللہ نے یہ بتانا چاہا ہے کہ میں قادرِ مطلق ہوں، میں جو چاہے کر سکتا ہوں؛ اس لیے سب انسانوں کے لیے بقا کا نظام ایسا بنایا کہ سامنے کی نالی سانس کے لیے بنائی، پیچھے کی نالی کھانے کے لیے بنائی، جب بھی نوالہ جائے گا، تو وہ سامنے کی نالی بند ہوگی، جب نوالہ پاس ہو جائے گا، تو کھل جائے گی، یہ نظام ہے اللہ تعالیٰ کا، اس نظام پر غور کریں، اور اس کا شکر بجا لائیں۔

”ناشکری“ ناسمجھی کا نتیجہ

اللہ کی ایسی نعمتوں کو استعمال کرنے کے باوجود بہت سارے لوگ اللہ کی ناشکری کرتے ہیں اور شکوہ، شکایت کرتے ہیں۔ ایک صاحب جو مولانا بھی ہیں، مجھ سے کہنے لگے کہ میرے بہت سے کام رُکے ہوئے ہیں، میں جو کام بھی سوچتا ہوں اور جو بھی کرنا چاہتا ہوں، اس میں کچھ نہ کچھ پریشانی آجاتی ہے اور وہ کام نہیں ہوتا؟

میں نے کہا کہ آپ کا یہ جملہ غلط ہے کہ جو بھی آپ سوچتے ہیں نہیں ہوتا اور یہ ناشکری ہے اللہ کی نعمتوں کی، جو دن رات آپ کی طرف متوجہ ہیں، میں نے ان

سے کہا کہ آپ سوچیے! آج صبح آپ بیدار ہوئے ہوں گے، تو آپ نے چاہا ہوگا کہ میں بستر پر سے اٹھوں اور اٹھ گئے؛ پھر اٹھنے کے بعد آپ نے سوچا ہوگا کہ یہاں سے چلوں اور بیت الخلا جاؤں اور چلے گئے تھے؛ پھر چاہا ہوگا کہ جو کچھ گندگی ہے اسے خارج کروں، وہ کام بھی ہو گیا تھا؛ پھر سوچا ہوگا کہ پانی اٹھاؤں، تو ہاتھ اُٹھے ہوں گے، پانی ملا ہوگا اور وضو کیا ہوگا۔

آدمی اس پر غور نہیں کرتا کہ میری مرضی کے مطابق اللہ تعالیٰ کیا کیا کام میرے کر دیتے ہیں؟ ہم گردن کو ادھر ادھر دیکھنے کے لیے حرکت دینا چاہتے ہیں، تو ادھر اور ادھر اس کو گھماتے ہیں، اگر یوں ہوتا کہ گردن گھومنے اور حرکت کرنے سے انکار کر دیتی، تو ہم کیا کر لیتے؟ ہم ہاتھ اُٹھانا چاہتے ہیں اور وہ اُٹھ جاتا ہے، اگر وہ نہ اُٹھتا یا اُٹھانے کے بعد نیچے نہ آتا، تو کیا کر لیتے؟ انگلیاں کھلتی اور بند ہوتی ہیں، اگر یہ کھل جاتیں بند نہ ہوتیں، تو کیا کر لیتے یا بند ہو جاتیں، نہ کھلتیں تو کیا کر لیتے؟ سوچیے! اس طرح ہم دن رات میں کتنی حرکتیں کرتے ہیں اور سب ہم اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت اور کرم کی وجہ سے ہمارا ساتھ دیتا ہے، اس طرح آپ صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عنایتیں ہیں، اس پر ذرا غور کیجیے اور پھر یہ سوچیے کہ آپ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ میرا کوئی کام نہیں ہوتا یہ حقیقت سے کس قدر دور ہے؟ "لاحول ولاقوۃ" یہی تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری و ناشکری ہے؟!!

انسان بڑا ہی ناشکرا ہے

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا، فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا فَاَثَرْنَ بِهٖ

نَقْعًا، فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ﴿﴾ [العٰدیٰت]

(ہانپتے ہوئے، دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم؛ پھر ٹاپ مار کر آگ جھاڑنے والے گھوڑوں کی قسم؛ پھر صبح کے وقت دھاوا بولنے والے گھوڑوں کی قسم۔ پس اس وقت گرد وغبار اڑاتے ہیں؛ پھر اسی کے ساتھ فوجوں کے درمیان گھس جاتے ہیں، یقیناً انسان بڑا ناشکرا ہے)

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ انسان بڑا ناشکرا ہے؛ کیوں کہ گھوڑا اپنے آقا و مالک کا اتنا فرماں بردار ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر میدانِ جہاد میں فوجوں کے درمیان گھس پڑتا ہے اور مالک کے ایک اشارے پر اپنی جان کو بھی ہلاکت میں ڈال دیتا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ اس کا یہ مجازی مالک اس کو کھانا دیتا ہے اور اس کے آرام کا کچھ سامان کر دیتا ہے؛ لیکن انسان گھوڑے سے بھی گیا گزرا ہے کہ وہ اپنے رب کی ہزارہا نعمتیں کھاتا ہے، استعمال کرتا ہے، اسی میں اس کی صبح وشام ہوتی ہے، پھر بھی وہ بڑا ناشکرا ہے، اللہ کا شکوہ کرتا ہے اور اطاعت کے موقعے پر اطاعت نہیں کرتا۔

بھائیو! اللہ تعالیٰ اس سورت میں انسانوں کی شکایت فرما رہے ہیں کہ وہ ہماری قسم ہا قسم کی نعمتیں کھا کر بھی اطاعت نہیں کرتا اور ناشکری کرتا ہے۔

ٹھنڈے پانی کی قدر جہنمیوں سے پوچھو!

اللہ کی ہر نعمت عجیب اور نہایت قیمتی ہے، پانی کی نعمت کیا کم ہے؟ یہ نعمت ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں؛ مگر ہمیں اس کی کوئی قدر نہیں، اس کی قدر جہنمی لوگوں سے پوچھو، جن کو صرف گرم گرم کھولتا ہوا پانی ملے گا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار ٹھنڈا پانی پیا اور رونے لگے اور رونا بھی شدید ہو گیا، تو پوچھا گیا کہ کیا بات ہے؟ تو

فرمایا کہ مجھے ایک آیت یاد آ گئی ﴿وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ﴾ (اور ان کافروں اور ان کی خواہشوں کے درمیان آڑ لا دی جائے گی) میں نے اس سے سمجھا کہ جہنمی لوگ صرف ٹھنڈا پانی چاہیں گے۔ (شعب الإيمان: ۱۴۹/۴)

مطلب یہ ہے کہ جہنمی لوگوں کو خواہش ہوگی ٹھنڈے پانی کی، تو ان سے اس کو ہٹا دیا جائے گا، ان کو نہیں دیا جائے گا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس کو یاد کر کے روتے تھے کہ آج یہ عظیم نعمت ہم کو مل رہی ہے؛ مگر ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔

ٹھنڈے پانی کا شکر بھی ہم سے نہیں ہو سکتا

یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ہم نہیں کر پاتے، ہمارے اندر اس کی قابلیت ہی نہیں ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے زمانے میں ایک شخص نے زُہد کی راہ اختیار کی اور کہا کہ میں خبیص جو کہ ایک قسم کا حلوا گھی اور کھجور سے بنتا ہے اور فالودہ نہیں کھاؤں گا؛ کیوں کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا، تو فرمایا کہ یہ تو احمق ہے، کیا وہ ٹھنڈے پانی کا شکر ادا کر سکتا ہے؟ (شعب الإيمان: ۱۳۹/۴)

جب ٹھنڈے پانی کا بھی شکر ہم سے نہیں ہوتا، تو کسی اور کا کیا ہوگا؟ اس لیے جس قدر ہو سکے اتنا تو آدمی بندہ ہونے کی حیثیت سے کرے۔

ہر مومن کے دل میں اللہ کی محبت ہوتی ہے؛ لیکن

ایک بات یہاں سمجھ لیجیے کہ وہ مومن نہیں ہے، جس کے دل میں اللہ کی محبت نہ ہو، جب ہمارے دلوں میں ایمان ہے، تو تھوڑی بہت محبت تو ضرور ہوگی؛ لیکن بعض

لوگوں کی محبت راکھ کے ڈھیر میں اندر چھپ گئی ہے اور بعض کی محبت راکھ سے باہر ہے اور ہوا اس کو اپنے جھونکوں سے بھڑکا رہی ہے اور ہر چیز میں وہ نظر آرہی ہے، ذکر کررہا ہے، تو اس میں بھی اللہ کے محبت کی جھلک ہے، نماز پڑھ رہا ہے، تو اس کے اندر بھی محسوس ہو رہی ہے اور اسی طرح اس کی چال ڈھال سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت والا ہے، اس لیے کہ اللہ کی محبت بھڑک رہی ہے۔ بعضوں کی محبت ایسی ہے کہ راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپ گئی ہے، راکھ کے ڈھیر کے اندر سے نکال کر اس کو ذرا ہوا کا جھونکا دیا جائے، تو انشاء اللہ وہ بھی بھڑکنے لگے گی۔

پہلے زمانے میں لکڑی کے چولہے جلتے تھے، اب بھی بہت جگہ جلتے ہوں گے، قریوں میں، دیہاتوں میں، تو وہاں ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں کھانا پکانے کے بعد ایک انگارا اٹھا کر راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپا دیتی ہیں؛ کیوں چھپاتی ہیں؟ اس لیے کہ دوسرے وقت کا کھانا جب پکانا ہوتا ہے، تو اس کو باہر نکال کر ذرا سی پھونک لگاؤ، تو پھر آگ بھڑک جاتی ہے اور مستقل تیاری کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لیے راکھ کے ڈھیر میں اس کو چھپا کر رکھ دیتی ہیں۔

اس طرح بہت سارے لوگوں کی محبتِ الٰہیہ راکھ کے ڈھیر کے اندر چھپ جاتی ہے۔ یہ راکھ کا ڈھیر کیا ہے؟ یہ ہمارے گناہ ہیں، کوتاہیاں اور برائیاں ہیں اور دنیا کی محبتیں ہیں، دنیا کی لالچیں ہیں اور دنیا کی حرص ہے، شہوتیں ہیں اور لذتیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں، جو ہماری محبتِ الٰہیہ کے اوپر آگئیں اور اس کو اندر چھپا کر رکھ دیا۔ اب ذرا آپ اس کو باہر نکالیے اور پھر اس کو ذرا جھونکا دیجیے، جھونکا کس چیز کا؟ اللہ کے ذکر کا جھونکا دیجیے، تلاوت کا جھونکا دیجیے، تو پھر محبتِ الٰہیہ بھڑکنے لگے گی اور بھڑکنے کے بعد وہ آگ کی چنگاری اور چنگاری سے آگ کا شعلہ بن جائے گی

اور سب کو جلا دے گی، آپ کے دل میں آ کر تمام لذتوں ،نفسانی خواہشوں ، نا جائز تمناؤں، شہوتوں سب کو جلا کر خاک کر دے گی۔

پھر دیکھیے اللہ کی محبت کیسے جاگ اٹھتی ہے اور پھر جیسے اولیا اللہ کے دلوں میں اللہ نے اپنی محبت سمادی، ہمارے دلوں میں بھی آ جائے گی؛لیکن اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے،بغیر محنت کے کام نہیں ہوگا، یہ لازم ہے کہ آدمی محنت کرے، بغیر محنت اگر سوسو کر گزارے گا،تو اللہ کی محبت کیسے پیدا ہوگی؟

ایک شاعر نے کہا ہے کہ

يَا نَائمَ اللَّيلِ! مَتىٰ ترْقُدُ ☆ قُمْ ياحَبيْبِي ! قَد دَنَا المَوعِدُ

مَنْ نَامَ حَتّٰى يَنْقَضيْ لَيْلُهُ ☆ لَمْ يَبْلُغِ الْمَنزِلَ لَوْ يَجْهَدُ

(اے سونے والے! کب تک سوئے گا؟ اے میرے پیارے! وقت تو ہو گیا ہے، ذرا اٹھ جا اور جو آدمی پوری رات سو کر گزارتا ہے، وہ منزل تک نہیں پہنچتا، اگر چہ کہ جدو جہد کرے)

منزل تک پہنچنے کے لیے ذرا صبح جا گنا ہے، اٹھنا ہے اور رات میں جاگ کر کچھ دیر اللہ تعالیٰ کو پکارنا ہے؛ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی محبت کی چنگاری بھڑک اٹھے گی ،تو اس لیے محنت ضروری ہے۔

اصل میں اللہ ہی ہم سے محبت کرتے ہیں

مگر ہماری یہ محنت صرف ایک علامت ہے، ورنہ اصل تو اللہ ہی ہم سے محبت کرتے ہیں ،انہی کی محبت کا اثر ہے کہ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں ۔ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے بنائے ،ان میں سے ایک حصہ اللہ نے دنیا میں بھیجا اور باقی ننانوے ۹۹

رحمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھی ہیں اور وہ قیامت کے دن کھولے گا اور اسی ایک حصے کی وجہ سے دنیا میں ماں، باپ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، جانور بھی اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، ایک آدمی دوسرے سے محبت کرتا ہے۔

(مسلم : ۲۷۵۲، ترمذي : ۳۵۴۱)

یہ دنیا میں جو محبتیں، الفتیں، تعلقات اور ایک دوسرے کے ساتھ رحم و کرم اور سلوک و احسان سب چل رہا ہے، اسی ایک رحمت کی وجہ سے ہے، اب اندازہ کرو کہ ایک رحمت کا حال یہ ہے کہ لوگ محبت میں جان دینے تک تیار ہو جاتے ہیں، ماں اسی ایک رحمت کی وجہ سے بچوں پر قربان ہو جاتی ہے، اگر بچے ذرا بیمار ہو جاتے ہیں، تو رات بھر اس کی نیند حرام ہو جاتی ہے، ڈاکٹروں کے یہاں دوڑ رہی ہے، بزرگوں سے دعائیں کرا رہی ہے اور تعویذات لا رہی ہے۔ تو وہ خالق و مالک جس کے پاس ایسی رحمت کے ننانوے ۹۹ حصے ہیں، اس کی رحمت اور محبت کا کیا عالم ہو گا، وہ بندوں سے کیسی محبت کرتا ہو گا؟!!!

مولانا روم رحمۃ اللہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرماتے ہیں "مادراں را مہر من آموختم" کہ اے لوگو اور ماؤں کی محبت پر ناز کرنے والو! ماں کو محبت کرنا میں نے ہی تو سکھایا ہے، ان کے جگر میں ممتا میں نے ہی تو رکھی ہے؛ لہٰذا میری محبت کا کیا عالم ہوگا، ہماری محبت کو بھی سوچا کرو کہ جب ہماری مخلوق میں یہ اثر ہے، تو ہم تمہارے ساتھ کتنی محبت کرتے ہیں؟ لیکن عام طور پر لوگ سوچتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کیسی ہے، ایسی رحمت والے پروردگار سے ہم محبت نہیں کرتے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ (اور لوگوں نے اللہ کی کماحقہٗ قدر نہیں کی)

ایک علمی نکتہ

اس پر مجھے ایک آیت کا اشارہ ذہن میں آ گیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [آل عمران: ۳۱]

(اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ کو چاہتے ہو، تو میری اتباع کرو، اللہ خود تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا)

اس میں اللہ تعالیٰ نے اولاً یہ بتایا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو، آپ کی سنتوں کو مضبوط تھام لو؛ پھر یہ بتایا کہ اگر تم نے ایسا کیا، تو خود اللہ تم کو چاہنے لگے گا؛ کیوں کہ ہم اللہ کو اس وقت تک نہیں چاہ سکتے، جب تک کہ اللہ ہم کو نہ چاہے۔

ایک شخص نے ایک باندی خریدی اور اپنے گھر لایا، وہ راتوں میں اُٹھ کر نماز پڑھتی اور روتی اور مناجات کرتی تھی، بڑی اللہ والی اور عابدہ، زاہدہ تھی، ایک رات اس شخص نے اس کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سامنے رو رہی ہے اور گڑگڑا رہی ہے اور اس طرح مناجات کر رہی ہے کہ "اے اللہ! تجھے اس محبت کی قسم جو تجھ کو مجھ سے ہے" یہ شخص اس کو سن کر اس کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اے عورت! اس طرح نہ کہنا؛ بل کہ یوں کہنا کہ "اے اللہ! جو محبت مجھے تجھ سے ہے، اس کی قسم" وہ باندی کہنے لگی کہ جا جا، سوچا ، اگر اس کو مجھ سے محبت نہ ہوتی، تو وہ تجھے کیوں سلاتا اور مجھے اپنے دربار میں کیوں بلاتا ؟ اصل میں اسی کو مجھ سے محبت ہے، تب جا کر میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

اللہ اکبر! کس قدر عارف باللہ باندی تھی کہ اس حقیقت کو سمجھ لیا، کہ اصل محبت تو اسی کی جانب سے ہوتی ہے۔

ایک شرابی پر اللہ تعالیٰ کی عنایت

حبیب عجمی رَحِمَہُ اللہ ایک بزرگ گزرے ہیں، وہ ایک دفعہ دریائے دجلہ کے کنارے پر بیٹھے ہوئے وضو کررہے تھے، تو وہاں ان کو ایک عجیب تماشا نظر آیا، وہ یہ کہ ایک بڑا کچھوا تھا، ایک بچھو دوڑتے ہوئے آکر اس کی پشت پر بیٹھ گیا اور کچھوا چل کر پانی میں کود گیا، اب یہ کچھوا اسے لے کر چلنے لگا، ان کو بڑا تعجب ہوا، دل میں خیال آیا کہ کوئی نہ کوئی بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کی ظاہر ہونے والی ہے؛ اس لیے چلو اس کے پیچھے جائیں گے، دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے؛ چناں چہ فوراً ایک کشتی میں بیٹھے اور اسی رخ پر یہ بھی چلنے لگے، دیکھا کہ اس کنارے سے اس کنارے ساحل پر وہ گیا اور کچھوا تو ایک جگہ ٹھہر گیا اور وہ بچھو وہاں سے اُتر کر جلدی، جلدی دوڑنے لگا، حبیب عجمی رَحِمَہُ اللہ بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے کہ دیکھیں کہاں جاتا ہے؟ کچھ دیر بعد دیکھا کہ وہ بچھو جا رہا ہے اور دوسری طرف ایک شرابی آدمی شراب کے نشے میں چور وہاں پر پڑا ہوا ہے، اسے کچھ خبر نہیں اور اس کے قریب تک ایک سانپ آگیا ہے، جو اس شرابی کو کاٹنے کے درپے ہے۔ یہ بچھو گیا اور سانپ پر حملہ کر کے اس کو مار دیا، سانپ مر گیا، بچھو اسے مار کر واپس چلا گیا۔

حبیب عجمی رَحِمَہُ اللہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں مناجات کرتے ہوئے سر بسجود ہوگئے اور کہنے لگے کہ ”اے اللہ! تیرا کیسا رحم ہے، کیسا کرم ہے، کیسا فضل ہے، کیسا احسان ہے کہ شرابی کو بچانے کے لیے اتنا بڑا انظام چلا رہا ہے، ادھر سے سانپ آکر اسے کاٹنے والا ہے، اس سانپ کو مارنے کے لیے بچھو کو دوسری جگہ سے بھیجا جاتا ہے اور اس کی سواری کچھوے کو بنایا جاتا ہے، جو ایک دریا کے کنارے سے دوسرے کنارے تک اس کو پہنچاتا ہے“، تو رو رو کر اللہ تعالیٰ کی تعریفیں بیان کرنے

لگے، اتنے میں وہ سویا ہوا آدمی جاگ اٹھا، دیکھا تو یہ بزرگ حبیب عجمی رحمۃ اللہ ہیں، کہنے لگا کہ حضرت! آپ یہاں کیسے آئے؟ تو انھوں نے کہا کہ ”دیکھ بھائی! میں نے ایک عجیب وغیب تماشہ دیکھا ہے، اللہ نے تیری حفاظت کے لیے ایسا ایسا کیا ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یہ دیکھ سانپ مرا پڑا ہے، جو تیرے سر تک کاٹنے کے لیے آگیا تھا، اگر ذرا بھی تاخیر ہوتی تو تجھے یہ ڈس لیتا؛ لیکن اللہ نے فوراً ایک بچھو کے ذریعے اس کو ختم کرایا اور تیری حفاظت کی“۔ یہ سن کر وہ شرابی بھی رونے لگا اور اللہ تعالیٰ کی اس عجیب وغریب رحمت پر شکر بجالایا اور اپنے گناہوں سے تائب ہوگیا۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ہمارا فرض ہے اور دنیا اور دنیا کی چیزوں سے لو نہ لگانا بھی اس کے لیے ضروری ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی محبتِ کاملہ عطا فرما کر اپنے محبوبین میں شامل فرمالے۔ آمین یا رب العالمین

عشقِ رسول
صلی اللہ علیہ وسلم
اور اس
کے تقاضے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے تقاضے

الحمدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلاةُ وَالسَّلامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ، أَمَّا بَعْدُ: فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ نَفْسِهٖ وَوَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ.

محبتِ الٰہی کی دو قسمیں

محبتِ الٰہیہ کی دو قسمیں ہیں: ایک کو "محبت فی اللہ" کہتے ہیں اور ایک کو "محبت للہ" کہتے ہیں، محبت فی اللہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت کی جائے، اور محبت للہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی نیک وصالح بندے سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کی جائے۔

جن بندوں سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کی جانی چاہیے، ان میں حضرات انبیائے کرام علیہم السلام، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، حضرات ائمہ وفقہائے عظام اور حضرات اولیائے کرام رحمہم اللہ کی ذواتِ مقدسہ داخل ہیں؛ پھر ان میں سے سب سے اولین درجہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو حاصل ہے؛ بل کہ ان سے محبت ایمان کا جزوِ لازم ہے؛ پھر حضرات انبیائے کرام میں سے بھی سب سے مقدم واہم ہمارے اور آپ کے مقدس ومحترم نبی سرورِ کائنات فخرِ موجودات رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات ہے۔

''عشقِ نبوی'' اصل ایمان ہے

اس لیے حضرت سرورِعالم محبوب دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت ایمان کے لیے لازم اور ضروری ہے۔کوئی شخص اس وقت تک ایمان دار اور مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہ کرے اور محبت بھی کیسی؟ ایسی کہ دنیا کے تمام رشتے وتعلقات اس پر قربان ہوں، مال ودولت اس پر نثار اور دل وجان اس پر نچھاور ہوں، ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، بچے، رشتہ دار واحباب سب ایک طرف اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ایک طرف ہو،تو مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ ان سب کے مقابلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ترجیح دیتا ہے،مال ودولت کے انبار ہوں، زیب وزینت کی بہار ہو، آرام وراحت کے اسباب ہوں،مزے دار کھانے اور مشروبات ہوں،خوش منظر ملبوسات ہوں،شان دار وفلک بوس عمارات ہوں، ہر چیز کو وہ محبت وعشقِ نبوی میں قربان کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی طبیعت بھی اسی کا اقتضا کرتی ہے۔

میں نے ابھی جو حدیث آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں اسی بات کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے:

''لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ إِلَیْهِ مِنْ وَالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْن ''(تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے ماں، باپ، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔ (بخاري: ۱۴، مسلم: ۶۳)

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بندہ

(یا یہ فرمایا کہ) کوئی آدمی مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ مجھے اپنے اہل وعیال ومال سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔ (مسلم: ۱/ ۴۹)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں! خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم مومن نہیں ہوسکتے، جب تک کہ میں تمہارے نفس سے زیادہ تم کو محبوب نہ ہوجاؤں“۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم اب آپ مجھے میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! اب (ایمان مکمل ہوا) اے عمر!۔ (بخاري: ۲/ ۹۸۱)

ان احادیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہونی چاہیے اور یہ ایمان کا تقاضا ہے؛ بل کہ اصل ایمان ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ ایک عظیم محدث گذرے ہیں، جنھوں نے مسلم شریف کی شرح لکھی ہے اور دیگر بہت سی حدیثی خدمات انجام دی ہیں، انھوں نے شرحِ مسلم میں لکھا ہے کہ

”قاضی عیاض نے فرمایا کہ ایمان کی حقیقت بغیر محبتِ نبوی کے مکمل نہیں ہوتی اور سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر ومنزلت کو ہر والد، ہر بچے، ہر فضل واحسان کرنے والے کی قدر ومنزلت پر بلند کیے بغیر ایمان صحیح نہیں ہوتا اور جو شخص اس بات پر عقیدہ نہ رکھے اور اس کے علاوہ پر اعتقاد رکھے، تو وہ مؤمن ہی نہیں ہے۔“

(شرح مسلم: ۱/ ۴۹)

معلوم ہوا کہ حُبِّ نبی اصل ایمان ہے، جس طرح اللہ کی محبت اصل ایمان ہے اور جیسے محبتِ الٰہی کے بغیر ایمان صحیح نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح محبتِ نبوی کے بغیر ایمان کا تحقق نہیں ہوتا۔

محبت کی تین قسمیں-شرحِ حدیث

ابھی جو احادیث میں نے نقل ہیں، ان میں غور کیجیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مومن کو اپنے والد، اپنی اولاد اور دیگر تمام لوگوں کی محبت سے زیادہ آپ سے محبت رکھنے کا حکم فرمایا ہے، یہاں ان تین قسم کے لوگوں کا ذکر کر کے ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ علامہ ابن بطال، قاضی عیاض وغیرہ حضرات نے بیان کیا ہے کہ محبت تین قسم کی ہوتی ہے:

(۱) محبتِ عظمت (۲) محبتِ شفقت (۳) محبتِ احسان۔

''محبتِ عظمت'' جیسے بچوں کو بڑوں سے محبت ہوتی ہے؛ مثلاً باپ دادا، استاد و پیر وغیرہ بڑوں سے جو محبت ہوتی ہے، یہ محبت عظمت کی بنا پر ہوتی ہے، اسی کو محبت عظمت کہتے ہیں۔ اور ''محبتِ شفقت'' وہ محبت ہے، جس کی بنا شفقت و پیار ہو، جیسے اپنی اولاد اور دیگر بچوں سے بڑوں کو جو محبت ہوتی ہے، وہ شفقت و پیار کی بنا پر ہوتی ہے، یہی محبتِ شفقت ہے۔ اور ''محبتِ احسان'' جس کی بنا احسان و کرم ہوتا ہے، جیسے عام لوگوں کو ایک دوسرے سے ہوتی ہے کہ کسی نے احسان کیا تو اس سے محبت ہوگئی۔

علما نے فرمایا کہ حدیث میں والد کا ذکر کر کے محبتِ عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ محبتِ عظمت سب سے زیادہ مجھ سے ہونا چاہیے اور جو اس محبت میں دوسروں کو مجھ پر ترجیح دے، وہ کامل ایمان والا نہیں اور اولاد کا ذکر کر کے محبتِ شفقت کی جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ محبتِ شفقت بھی سب سے

زیادہ مجھ سے ہونا چاہیے۔ اور دیگر لوگوں کے تذکرے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس طرح لوگ ایک دوسرے سے احسان وفضل کی وجہ سے محبت رکھتے ہیں، یہ محبتِ احسان بھی مجھ سے غالب ہونا چاہیے۔ (شرح مسلم: ۱/۴۹)

ایک اور نکتہ

علما کے اس کلام میں باپ، اولاد اور دیگر لوگوں سے محبت پر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو غالب کرنے کے بارے میں حدیث میں مذکور ان تین قسم کے لوگوں کی تخصیص کی حکمت بتائی گئی ہے؛ مگر بعض اور روایات میں جو اہل ومال اور نفس کا ذکر آتا ہے اس سے کس جانب اشارہ ہے؟ احقر کے خیال میں یہ آتا ہے کہ نفس سے اشارہ ناجائز خواہشات کی طرف اور مال سے تمام دنیوی ساز وسامان واسباب کی طرف ہے اور اہل یعنی بیوی سے تمام جائز خواہشات کی طرف اشارہ ہے۔ تو حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تمام جائز وناجائز خواہشات اور تمام دنیوی اسباب وساز وسامان پر جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ترجیح نہ دے گا، کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا۔

محبتِ عقلی وطبعی میں کون افضل ہے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ یہاں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حدیث میں نفس سے اشارہ محبتِ طبعی کی طرف ہو اور دوسری چیزوں سے اشارہ محبتِ عقلی کی طرف ہو اور اس احتمال پر یہاں ایک بحث یہ پیدا ہوجاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت ہونا چاہیے، وہ محبت طبعی ہے یا محبتِ عقلی؟ جمہور علما کی رائے یہ ہے کہ مراد محبتِ عقلی ومحبتِ ایمانی ہے، محبتِ طبعی مراد نہیں۔

(فتح الباری: ۱/۵۹، شرح مسلم: ۱/۴۹، مرقات: ۱/۷۳)

جمہور علما کا کہنا یہ ہے کہ محبتِ طبعی غیر اختیاری ہوتی ہے اور پھر محض ایک جذباتی چیز ہے، جس کو پائے داری حاصل نہیں، اس لیے انسان اس کا مکلّف نہیں ہوسکتا اور اس کے برخلاف محبتِ عقلی اختیاری بھی ہوتی ہے اور پائے دار بھی ہوتی ہے؛ اس لیے محبتِ عقلی ہی مراد ہے اور افضل بھی وہی ہے۔

مگر حضراتِ صوفیا میں سے بعض کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں اللہ و رسول سے محبت سے مراد محبتِ طبعی ہے اور وہ حضرات اسی کو افضل قرار دیتے ہیں؛ مگر اس سلسلے میں میرے مرشدِ روحانی حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ نے ایک گہری بات فرمائی ہے: وہ یہ کہ محبتِ طبعی مطلوب نہیں؛ بل کہ محبتِ عقلی مطلوب ہے؛ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ حب عقلی والوں یعنی کاملین میں حبِ طبعی نہیں ہوتی؛ بل کہ مطلب یہ ہے کہ غلبہ حب عقلی کو ہوتا ہے، باقی جن پر حبِ عقلی کا غلبہ ہوتا ہے، بعض اوقات ان میں محبتِ طبعی بھی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے، جن پر محبتِ طبعی کا غلبہ ہے، مگر وہاں محبتِ طبعی پر حب عقلی غالب ہوتی ہے، اس لیے جوش دبا رہتا ہے؛ لیکن گاہے، گاہے کاملین پر بھی حبِ طبعی کا غلبہ ہوتا ہے۔

بہرحال! کاملین تو حبِ عقلی اور حبِ طبعی دونوں کے جامع ہوتے ہیں: مگر ان میں غلبہ عقلی کو ہوتا ہے اور ناقصین میں حبِ طبعی کا غلبہ ہوتا ہے، یہ کمال گو مطلوب نہیں؛ مگر محمود ضرور ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ افضل واعلیٰ اور مامور بہ تو محبتِ عقلی ہی ہے؛ البتہ محبت عقلی سے پھر محبتِ طبعی بھی عموماً پیدا ہوجاتی ہے، گویا محبتِ عقلی کے بعد محبتِ طبعی کا بھی حاصل ہوجانا، یہ انتہائی کمال اور انتہائی محبت وعشق کی بات ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعے کی شرح

اور غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعے میں، جو ابھی عرض کیا گیا، اسی کی جانب اشارہ ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ آپ نے ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ میں تمہارے نفس سے زیادہ تم کو محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! اب آپ مجھے میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب (ایمان مکمل ہوا) اے عمر!۔

اس واقعے میں علمائے محدثین نے کافی کلام کیا ہے، بعض نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو یہ سمجھا کہ محبتِ طبعی مامور بہ ہے اور میں اپنے اندر نفس کے بارے میں اس کو نہیں پاتا؛ لہٰذا اولاً یہ عرض کیا کہ سوائے میرے نفس کے آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنی ذات سے بھی زیادہ مجھ سے محبت نہ رکھو، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ مراد محبتِ عقلی ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے زیادہ ہے، تو دوبارہ عرض کیا کہ میں میری ذات سے بھی زیادہ آپ سے محبت رکھتا ہوں۔

(دیکھو: فتح الباری: ۱۱/ ۵۲۸، مرقات: ۱/ ۷۴)

اور حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ایک توضیح یہ بیان کی ہے اور واقعی بڑی لطیف توضیح و عجیب بات فرمائی ہے، وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو محبتِ عقلی و ایمانی تو حضور

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حاصل تھی کہ کسی چیز حتی کہ ذات سے بھی ایسی نہیں تھی اور یہی محبتِ عقلی مؤمن پر فرض وواجب ہے؛ البتہ محبتِ طبعی اپنی ذات سے زیادہ نہ تھی؛ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی کہ مجھے ہر چیز سے زیادہ آپ سے طبعی طور پر بھی محبت ہے، جیسے عقلی طور پر ہے؛ البتہ اپنی ذات سے طبعی محبت آپ کی محبت پر غالب پاتا ہوں، تو اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی روحانی توجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف فرمائی اور اس توجہ کا یہ اثر ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں آپ کی طبعی محبت بھی اپنی ذات سے زیادہ اور غالب ہوگئی اور اس بات کو آپ کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ظاہر کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب تمہارا ایمان کامل ہو گیا۔

(دیکھو: مرقات: ۱/۷۴)

غرض یہ کہ درجۂ فرض میں تو محبتِ عقلی مراد ہے اور درجۂ استحسان میں محبتِ طبعی مراد ہے؛ لہٰذا چاہیے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت رکھیں کہ کسی سے ایسی محبت نہ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سامنے ہر چیز ہیچ ہو، لغو ہو، بے حیثیت ہو، بے وقعت ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''محبتِ غالبہ'' کا مطالبہ

اسی لیے قرآن نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محض محبت کا مطالبہ نہیں کیا؛ بل کہ آپ سے محبتِ غالبہ رکھنے کا مطالبہ کیا ہے؛ چناں چہ فرمایا ہے: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [التوبة: ۲۴]

(اگر تمہارے آباواجداد، تمہاری اولاد، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، تمہارے وہ مال، جو تم نے کمائے ہیں اور تمہاری وہ تجارت، جس کے گھاٹے کا تم کو خطرہ ہوتا ہے اور تمہارے مکانات، جس کو تم پسند کرتے ہو؛ یہ سب چیزیں اگر تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں، تو تم انتظار کرو کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے اور یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔)

علامہ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے لازم ہونے، فرض ہونے اور اس کے عظیم ہونے اور محبت کے آپ کے حق ہونے پر کافی طور پر دلالت و تنبیہ کرتی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو دھمکایا ہے، جو آپ سے زیادہ کسی اور کو محبوب رکھتا ہو اور اس کو وعید سنائی ہے کہ اللہ کے عذاب کا انتظار کرو اور ان کو فاسق قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں اور اللہ نے ان کو ہدایت نہیں دی ہے۔ (الشفا: ۲/۱۷)

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت بہت سخت ہے، اتنی سخت آیت قرآن مجید میں کوئی اور نہیں ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دوسروں کی محبت کو اپنی محبت پر غالب کرنے والوں کو عذاب کی دھمکی دی ہے۔ معلوم ہوا کہ بہت سخت بات ہے کہ اللہ و رسول کی محبت کو چھوڑ کر کسی اور کی محبت کو زیادہ کر لیا جائے غالب کر لیا جائے۔

غرض یہ کہ اس آیت میں یہ مطالبہ ہے کہ اللہ و رسول کو سب چیزوں سے زیادہ محبوب رکھو، اگر اتنی ہی محبت اللہ و رسول سے کیا جتنی کہ ماں باپ سے، اپنی اولاد

سے، بیوی سے، مال ودولت سے، تجارت وملازمت سے محبت ہے، تو وہ بھی اس وعید کا مستحق ہے؛ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محض محبت کافی نہیں؛ بل کہ غالب محبت ہونا چاہیے۔

عشقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ثمرہ

جب ایسی محبت ہوگی، تو اس کا ثمرہ کیا ہے؟ اس کا ذکر حدیث میں ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! آپ مجھے میرے اہل وعیال اور مال سے زیادہ محبوب ہیں اور میں آپ کو یاد کرتا ہوں، تو صبر نہیں آتا، پس میں آتا ہوں اور آپ کی زیارت کرتا ہوں اور جب میں آپ کے وصال اور میرے مرنے کو یاد کرتا ہوں، تو پریشان ہوجاتا ہوں؛ کیوں کہ جانتا ہوں کہ آپ جنت میں نبیوں کے ساتھ بلند درجات میں ہوں گے اور میں وہاں آپ کو دیکھ نہ سکوں گا''۔

ان صحابی کی اس کیفیت پر جواب میں ان کو تسلی دینے کے لیے اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [سورۃالنساء: ۶۹]

(اور جو اللہ ورسول کی اطاعت کریں گے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام کیا؛ یعنی انبیائے کرام، صدیقین، شہدا اور صالحین اور یہ لوگ بہترین ساتھی ہیں)

اس آیت کے نازل ہونے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو بلا کر یہ آیت سنادی۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۲۲)

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و محبت کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اس کو ان حضرات کی صحبت جنت میں بھی نصیب ہوگی۔

دوسری بات: یہ معلوم ہوئی کہ سچی محبت وہی ہے، جس میں اطاعت ہو؛ کیوں کہ قرآن نے ان صحابی کے جواب میں اور ان کی تسلی کے لیے یہ فرمایا کہ جو اللہ و رسول کی اطاعت کریں گے، وہ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے۔ اس میں اشارہ ہے کہ محض دعوئے محبت و عشق سے یہ دولت نصیب نہیں ہوگی؛ بل کہ محبت کے ساتھ اطاعت ہو، تب یہ دولت حاصل ہوگی، ورنہ اللہ تعالیٰ ان صحابی کا جواب یوں فرماتا "من یحب اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم" (کہ جو اللہ و رسول سے محبت کریں گے، وہ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے) مگر اس کے بہ جائے اطاعت کا ذکر کیا؛ معلوم ہوا کہ اصلی و سچی محبت وہی ہے، جس میں اپنے محبوب کی اطاعت کا جذبہ ہو، یہی چیز انسان کو مراتبِ عالیہ پر فائز کرتی ہے۔

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بے نظیر نمونہ

حضرات صحابہ کرام کی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عشق کا عجیب حال تھا۔ اوپر جو آیت ایک صحابی کے واقعے میں پیش کی گئی، یعنی " من یطع اللہ والرسول" الخ اس کے شانِ نزول میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب آپ بھی انتقال فرما جائیں گے اور ہم بھی مر جائیں گے، تو آپ علیین میں ہوں گے، جہاں سے ہم نہ آپ کو دیکھ سکیں گے اور نہ آپ کے ساتھ جمع ہو سکیں گے؛ پھر انھوں نے اس پر بڑے ہی حزن اور غم کا اظہار کیا، تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی، (جس میں ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت، جو بھی کرے گا وہ انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ ہوگا)۔

انہی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، تو انھوں نے دعا کی کہ "اللّٰهُمَّ أَعمِنِیْ حتّٰی لَا أَرٰی شَیْئاً بعدَهٗ" (اے اللہ! مجھ کو اندھا کر دے؛ تا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی چیز کو نہ دیکھ سکوں)، ان کی یہ دعا فوراً قبول ہوئی اور اسی وقت وہ نابینا ہو گئے۔ (تفسیر قرطبي: ۵/ ۲۷۱)

اللہ اکبر! کیا عشق تھا، محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہ آپ کے بعد اپنی آنکھوں سے کسی کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے، گویا یہ آنکھیں صرف اس لیے تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے زیارت کریں، جب آپ کا وصال ہو گیا، تو اب اس کا امکان نہ رہا، تو آنکھوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی، وہ آنکھیں کس کام کی، جن سے محبوب کا دیدار نہ ہو؟

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کا عشق

ایک اور صحابی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں، ان کا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت میں یہ حال ہو گیا کہ ایک دفعہ حاضرِ خدمت ہوئے اور رنگ بدلا ہوا تھا اور جسم نحیف و کمزور ہو گیا تھا اور چہرے پر غم اور حزن کے آثار نمایاں تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ثوبان! تمہارا رنگ کیوں بدلا ہوا ہے؟ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ نہ مجھے کوئی نقصان ہوا اور نہ درد ہے؛ لیکن بات یہ ہے کہ جب میں آپ کو نہیں دیکھتا، تو بے قرار ہو جاتا ہوں اور شدید وحشت و گھبراہٹ محسوس کرتا ہوں اور جب تک آپ کو نہ دیکھ لوں اور آپ سے نہ مل لوں قرار نہیں آتا۔ جب میں نے آخرت کا معاملہ سوچا، تو اندیشہ ہوا کہ میں وہاں آپ کو نہ دیکھ سکوں گا؛ کیوں

کہ میں جانتا ہوں کہ آپ انبیا کے ساتھ بلند ترین مقام پر ہوں گے اور میں اگر جنت میں داخل بھی ہوا، تو آپ کے درجے سے کم درجے پر رہوں گا اور اگر جنت میں داخل ہی نہ ہوسکا، تو پھر کبھی بھی آپ کو نہ دیکھ پاؤں گا، یہ سوچ کر مجھ کو غم ہوگیا اور یہ حال ہوگیا ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ انہی کے اس واقعے پر وہ آیت نازل ہوئی، جو اوپر پیش کی گئی ہے۔ (قرطبي: ۵/ ۲۷۱)

ایک طالب علمانہ شبہ کا جواب

یہاں ایک طالبِ علمانہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اوپر پیش کردہ آیت اور روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ و رسول کی محبت کا یہ ثمرہ ہے کہ محبت رکھنے والے انبیا و صدیقین، شہدا و صالحین کے ساتھ جنت میں رہیں گے؛ حالاں کہ یہ بدیہی البطلان ہے؛ کیوں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ انبیا و غیرِ انبیا کا درجہ ایک ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت و حدیث میں معیت اور ساتھ ہونے کا جو ذکر ہے، اس سے مراد ایک خاص معیت اور صحبت ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے درجے اور منزل میں رہتے ہوئے حسبِ ضرورت و موقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت و ملاقات کا شرف پاسکے گا، جیسے دنیا میں آپ کی ملاقات و زیارت سے صحابہ کرام مشرف ہوتے تھے؛ چناں چہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد معیتِ خاصہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جنت میں محبّ و محبوب کے درمیان ملاقات کا موقعہ حاصل ہوگا، یہ مراد نہیں کہ وہ دونوں ایک ہی درجے میں ہوں گے؛ کیوں کہ یہ بدیہی طور پر باطل ہے۔ (مرقات: ۹/ ۲۵۱)

اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مقام پر اور ایک ہی قسم کی نعمتوں میں ہوں گے اور ایک دوسرے سے ملاقات اور

ایک دوسرے کی زیارت سے متمتع ہوں گے۔ یہ معنی نہیں کہ وہ سب درجے میں برابر ہوں گے؛ کیوں کہ ان کے درجات الگ الگ ہوں گے؛ لیکن وہ ایک دوسرے کی زیارت کریں گے، بوجہ اس کے کہ دنیا میں اتباع واقتدا کرتے تھے۔

(قرطبي: ۵/ ۲۷۲)

اور علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معیت سے مراد درجے میں اتحاد نہیں ہے اور نہ مطلق دخولِ جنت میں اشتراک مراد ہے؛ بل کہ یہ مراد ہے کہ وہ وہاں ایسا رہیں گے کہ ان میں ہر ایک کو دوسرے کی دیدار وزیارت کا موقعہ ملے گا، اگرچہ ایک کی جگہ دوسرے سے مسافتِ بعیدہ پر ہو۔ (روح المعاني: ۵/ ۷۸)

غرض! یہ کہ جن کے دل عشق ومحبتِ نبوی سے سرشار ہوں گے، ان کو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور ملاقات کا موقعہ ملے گا، اسی بات کو احادیث میں معیت سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ نہیں کہ محبت والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجے میں رہیں گے۔

بھائیو! مگر یہ دولت بھی کیا کم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور ملاقات کا شرف جنت میں بھی ملتا رہے۔ خدا کی قسم اگر کچھ نہ ملتا اور جنت میں صرف یہی دولت ونعمت مل جاتی تب بھی یہ سودا بہت سستا تھا۔

اسلام کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کی سب سے بڑی خوشی

اسی وجہ سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس وقت نہایت درجہ خوش ہوئے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ ” اَلْمَرْأُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ“ (آدمی جنت میں اس کے ساتھ ہوگا، جس سے محبت رکھے گا)۔

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب ہوگی؟ آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ ان صاحب نے عرض کیا کہ میں نے کچھ تیاری نہیں کی ہے؛ مگر یہ کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم اس کے ساتھ ہوگے، جس سے محبت کرتے ہو''۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں یعنی صحابہ کرام کو نہیں دیکھا تھا کہ وہ اسلام کے بعد کسی چیز سے اس قدر خوش ہوئے ہوں، جتنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے خوش ہوئے۔

(مشكل الآثار: ١/ ٤٢١)

ایک حدیث میں ہے کہ اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے نہ روزوں کی کثرت سے، نہ نماز کی کثرت سے، نہ صدقے کی کثرت سے، کسی سے تیاری کی نہیں ہے؛ لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔

(بخاري: ٢/ ١٠٥٩)

ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ صاحب جنھوں نے سوال کیا تھا ''حضرت ذوالخویصرہ یمنی رضی اللہ عنہ'' تھے اور انہیں نے ایک دفعہ اسلام لانے سے قبل مسجد میں پیشاب کردیا تھا۔ (فتح الباري: ١١/ ٥٥٥)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابۂ کرام کے لیے یہ بہت ہی زیادہ خوشی کا موقعہ تھا، جب کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ آدمی اس کے ساتھ ہوگا، جس سے محبت رکھے گا۔ اسی طرح ہر مسلمان کے لیے یہ ارشاد خوشی وسرور کا پیغام ہے اور امید کی ایک کرن ہے، ورنہ ہمارے پاس کون سا ایسا عمل ہے

کہ جنت کی تمنا و آرزو کر سکیں؟

غرض یہ کہ یہ محبت بڑی دولت ونعمت ہے کہ جنت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت وملاقات کا موقعہ مل جائے؛ مگر یہ دولت کس کو نصیب ہوگی؟ عشق ومحبتِ نبوی میں جو سچا اور پکا ہو، اس کو یہ دولت نصیب ہوگی؛ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی و پکی محبت پیدا کرنا چاہیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام "اسبابِ محبوبیت" جمع ہیں

اور کیوں نہ ہو جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر وہ سارے اسباب جمع ہیں، جو کسی کو مقامِ محبوبیت تک پہنچاتے ہیں اور پھر ہر سبب علی وجہ الکمال آپ میں پایا جاتا ہے۔ جمال میں دیکھو، تو آپ بے مثال ہیں، کمال میں دیکھو تو آپ بے نظیر ہیں، عطاونوال میں دیکھو، آپ لاثانی ہیں، آپ کی ہر چیز نرالی وعجیب ہے؛ لہٰذا خدا تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ چاہے جانے اور محبت کیے جانے کے قابل کوئی ہے، تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہستی ہے۔

جمالِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

چناں چہ حسن وجمال کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مثال نہیں ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام دنیا میں سب سے زیادہ حسین تھے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے؛ مگر اس عموم میں حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل نہیں ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام دنیا کے تمام حسینوں میں سب سے زیادہ حسین تھے اور تمام جمیلوں میں سے زیادہ صاحبِ جمال تھے، مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہیں؛ کیوں کہ آپ کا حسن وجمال،

حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی بڑھا ہوا تھا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تلوار کی مانند چمک دار تھا؟ تو حضرت براء نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور تو چاند کی طرح تھا۔

(شمائلِ ترمذی:۲،مشکوٰۃ:۵۱۵)

ایک صحابی حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوتے، تو آپ کا چہرہ چمک اٹھتا، گویا کہ چاند کا ٹکڑا ہے اور یہ بات ہم سب جانتے تھے۔ (مشکوٰۃ:۵۱۷)

حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے، تو گویا تم سورج کو دیکھتے۔ (مشکوٰۃ:۵۱۷)

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چاندنی رات میں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، پس کبھی میں آپ کی طرف نظر کرتا اور کبھی چاند کو دیکھتا، اس وقت آپ کے جسمِ مبارک پر سرخ چادر تھی، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاند سے بھی زیادہ حسین تھے۔ (شمائلِ ترمذی:۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین کسی چیز کو نہیں دیکھا، گویا کہ سورج آپ کے چہرۂ انور میں چل رہا ہے۔

(مشکوۃ: ۵۱۸)

حضرت عائشہ وحضرت حسان رضی اللہ عنہما کے اشعار

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے دو شعر آپ کے حسن وجمال کی تعریف میں بڑے عجیب ہیں، وہ کہتی ہیں:

فَلَوْ سَمِعُوْا فِيْ مِصْرَ أَوْصَافَ خَدِّهٖ
لَمَا بَذَلُوْا فِيْ سَوْمِ يُوْسُفَ مِنْ نَقْدٍ

لَوَاحِيْ زُلَيْخَا لَوْ رَأَيْنَ جَبِيْنَهٗ
لَآثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَى الْأَيْدِ

جس کا خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ اگر مصر والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رخِ انور کے اوصاف سن لیتے، تو حضرت یوسف علیہ السلام کے سودے میں کچھ نقد مال نہ لگاتے اور اگر زلیخا کی سہیلیاں آپ کی جبین کو دیکھ لیتیں، تو ہاتھ کے بجائے اپنے دلوں کو چاک کر ڈالتیں۔

اور شاعرِ رسول حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اشعار ہیں:

وَأَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِيْ
وَأَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ
كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

(یعنی آپ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے قطعاً نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ جمیل عورتوں نے نہیں جنا، آپ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے ہیں، گویا آپ ایسے پیدا ہوئے ہیں جیسے خود آپ نے چاہا ہو۔)

جمالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر مزے دار روایات

یہ تو آپ کے چہرۂ انور کے جمال کا حال ہے، اس کے علاوہ ایک صحابی حضرت سُراقہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پنڈلی دیکھنے لگا، گویا کہ وہ انگارہ ہے (یعنی سرخ ہے) اور مہرش الکعبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ دیکھی گویا کہ وہ چاندی کی تختی ہے۔

(فتح الباري: ٦/ ٥٧٠)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل گورے رنگ کے تھے اور آپ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا اور فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی دیباج اور ریشم کا کپڑا ابھی ایسا نہیں چھوا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو اور نہ کوئی مشک اور عنبر ایسا سونگھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو سے زیادہ خوشبودار ہو۔ (مشکوٰۃ: ۵۱۷)

حضرت امِ سلیم رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ جمع فرماتیں اور اسے عطر میں ملا دیتیں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ آپ کا پسینہ ہے، ہم ہمارے عطر میں اس کو ڈال لیتے ہیں اور وہ سب سے زیادہ عمدہ عطر ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ: ۵۱۷)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی جب وفات ہونے لگی، تو وصیت فرمائی کہ اس عطر میں سے ان کو بھی لگایا جائے۔ (مرقاۃ: ۱۱/ ۷۹)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گال پر اپنا ہاتھ پھیرا، تو میں نے اس کی ٹھنڈک اور خوشبو محسوس کی گویا کہ وہ ابھی ابھی عطار کی شیشی میں ڈال کر نکالا گیا ہو۔ (مشکوٰۃ: ۵۱۷)

میں نے بطورِ نمونہ چند احادیث کے حوالے پیش کیے ہیں، جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

حضراتِ علما کے ارشادات

علامہ مناوی اور ملا علی قاری رحمہما اللہ نے علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا یہ روح

افزا قول نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا حسن و جمال دنیا میں ظاہر نہیں ہوا، ورنہ آپ کو دیکھنے کی آنکھوں میں طاقت نہ ہوتی۔

(جمع الوسائل: ۱/۹ وشرح شمائل للمناوی علی هامش جمع الواسل: ۱/۱۸)

حضرت شیخ زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ ''شمائلِ ترمذی'' کی شرح میں لکھتے ہیں کہ

''مناوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ہر شخص یہ اعتقاد رکھنے کا مکلّف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسمِ مبارک جن اوصافِ جمیلہ کے ساتھ متصف ہے، کوئی دوسرا ان اوصاف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نہیں ہوسکتا اور یہ محض اعتقادی چیز نہیں، سیر و تاریخ واحادیث کی کتابیں اس سے لبریز ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے کمالاتِ باطنیہ کے ساتھ جمالِ ظاہری بھی علی وجہ الاتم عطا فرمایا تھا''۔

(خصائلِ نبوی:۱۶)

بھائیو! غور کرو کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ جسمانی لحاظ سے بھی کوئی آپ کا ثانی نہیں، آپ بے نظیر و بے مثال ہیں، تو آپ کے باطنی کمالات کے بارے میں کیا خیال ہے؟

کمالِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

یہ تو جمال کا ذکر تھا، اب لیجیے آپ کا کمال!! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال کی طرف نظر کیجیے، تو وہ بھی بے مثال اور بے نظیر ہے، کمالِ علمی کو لیجیے، تو وہ عروج کی انتہائی منزلوں پر پہنچا ہوا ہے۔ سب مخلوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ علم عطا فرمایا تھا اور علمِ غیب میں سے اللہ نے آپ کو بہت سی باتوں پر مطلع کیا، اس قدر امور پر کہ کسی اور کو اس قدر باتوں پر مطلع نہیں کیا گیا۔

امام ابوصیری رحمہ اللہ نے قصیدۂ بُردہ میں فرمایا کہ

فَإِنَّ مِنْ جُوْدِکَ الدُّنْیَا وَ ضَرَّتِھَا
وَ مِنْ عُلُوْمِکَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

(آپ ہی کی سخاوت سے یہ دنیا اور آخرت ہے اور آپ کے علوم سے لوح وقلم کا علم ہے)

اور یہ کمالِ علمی دلیل ہے، آپ کے کمالِ عقلی کا، کیوں کہ علمی کمال بغیر کمالِ عقل کے ممکن نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ عقلی کا ایک واقعہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمالِ عقلی اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جب قریشِ مکہ نے کعبۃ اللہ کی عمارت کو از سرِ نو تعمیر کیا اور اس وقت حجرِ اسود کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا، تو تعمیر کے بعد قریش کے قبائل نے اس بارے میں اختلاف کیا کہ حجرِ اسود کو کون اپنی جگہ نصب کرے؟ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ فضیلت اس کو ملے، یہاں تک نوبت پہنچی کہ لوگ اپنی بہادری اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے عربوں کے دستور ورواج کے مطابق پیالوں میں خون بھر کر اس میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگے کہ یہ فضیلت ہم حاصل کریں گے۔

اس میں اشارہ تھا کہ ہم جنگ کے لیے بھی تیار ہیں۔ ایک تجربہ کار بوڑھے نے مشورہ دیا "کہ ایسا کرو کہ کل صبح جو آدمی سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں داخل ہو اسی کو اس کا اہل سمجھا جائے کہ وہ کعبۃ اللہ میں حجرِ اسود نصب کرے"۔ اس پر سب کا اتفاق ہوگیا، جب صبح ہوئی، تو سب سے پہلے اس میں داخل ہونے والے وہ ہمارے اور آپ کے آقا سرکارِ مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جب قریش

نے آپ کو دیکھا تو خوش ہو گئے اور آپ سے کعبۃ اللہ میں حجرِ اسود نصب کرنے کے لیے کہا؛ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کمالِ عقلی کا مظاہرہ فرماتے ہوئے عجیب تدبیر پیش فرمائی، آپ نے فرمایا کہ ایک چادر بچھا دو، جب چادر ڈال دی گئی، تو آپ نے اپنے دستِ مبارک سے حجرِ اسود کو اٹھا کر اس میں رکھا؛ پھر تمام سردارانِ قریش سے فرمایا کہ سب اس چادر کو پکڑ کر چلیں، جب چلے، تو کعبۃ اللہ کے پاس آپ نے رُکوا کر اپنے دستِ مبارک سے حجرِ اسود کو نصب کر دیا، خود بھی اس فضیلت سے مشرف ہوئے اور سب کو بھی شامل کر لیا اور ایک بڑی جنگ سے لوگوں کو بچا لیا۔ یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔ (دیکھو: سیرۃ ابن ھشام : ۱/۱۹۷)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کمال فصاحتِ لسانی کا عطا فرمایا گیا تھا اور اس میں بھی آپ بے نظیر تھے، حتی کہ حضرات صحابۂ کرام کو بعض وقت آپ کی گفتگو سمجھنے میں دقت پیش آتی اور وہ آپ کی انتہائی فصیح و بلیغ زبان، جو انتہائی کمالِ عروج کو پہنچی ہوئی تھی، سمجھ نہ سکتے؛ اس لیے بسا اوقات آپ کو بات دہرانی پڑتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہم میں ہی رہے؛ پھر بھی آپ ہم میں سب سے زیادہ فصیح ہیں، یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا کہ حضرت اسماعیل کی زبان کی فصاحت مٹ گئی تھی، حضرت جبرئیل اس کو لے کر میرے پاس آئے اور میں نے اس کو یاد کیا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ سے حضراتِ صحابہ نے عرض کیا کہ آپ اور ہم ایک ہی خاندان کے ہیں اور ایک ہی شہر میں زندگی کر رہے ہیں؛ مگر آپ ایسا کلام کرتے ہیں کہ ہم سمجھ نہیں پاتے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب کی تعلیم دی ہے اور بہترین تعلیم دی ہے۔ (جمع الوسائل: ۸/۲)

اورایک کمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی کمال ہے،کمالِ اخلاق کا یہ عالم کہ جوآپ کودیکھتااورآپ کے اخلاق کودیکھتاوہ آپ کا گرویدہ ہوجاتا۔حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عمدہ اخلاق والے تھے۔ (شمائلِ ترمذی:۲۳)

غرض یہ کہ کسی طرح کا بھی کمال ہو،وہ آپ میں علی وجہ الاتم والاکمل پایا جاتا ہے،اسی لیے علامہ مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علما نے تصریح کی ہے کہ کمالِ ایمان یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ صاحبِ کمال نہیں اور نہ کوئی ایسا ہے،جوآپ کے برابر صاحبِ کمال ہو۔

(شرح شمائل علی حامش جمع الوسائل: ۱۸/۱)

ایسے صاحبِ کمال کے بارے میں کیا خیال ہے؟جب کہ معمولی سے معمولی کمال بھی باعثِ محبت ہوا کرتا ہے،تو آپ سے محبت وعشق بھی سب سے زیادہ لازم وضروری ہوئی۔

عطاونوالِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

محبت کا تیسرا سبب ”عطاونوال“ بھی آپ کے اندرعلی وجہ الکمال پایا جاتا ہے، آپ نے ظاہری وباطنی مادی وروحانی عطیہ جات اتنے دیے ہیں کہ ان کا شمار کرنا دشوار ہے۔حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ ” اَجْوَدُالنَّاسِ “ یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے۔ (مشکوٰۃ:۵۱۷،شمائلِ ترمذی:۱)

اورایک روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس چیز کا بھی سوال کیا گیا،آپ نے ”نا“ نہیں فرمایا۔

(فتح الباري: ۱۳۱/۱)

اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان، اسلام، دین کے احکام، وحی وقرآن، عمدہ اخلاق ونیک اعمال کے ہدایا (تحفے) امت کو عطا فرمائے ہیں، یہ باطنی وروحانی عطیہ جات ہیں، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بوصری رحمہ اللہ نے قصیدۂ بردہ میں فرمایا کہ

فَإِنَّ مِنْ جُوْدِکَ الدُّنْیَا وَ ضَرَّتِهَا

وَ مِنْ عُلُوْمِکَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

(آپ ہی کی سخاوت سے یہ دنیا اور آخرت ہے اور آپ کے علوم سے لوح وقلم کا علم ہے)۔

غرض! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دین ودنیا میں سے بہت کچھ عطا فرمایا تو آپ سے محبت نہ ہو، تو پھر کس سے ہو؟ اس طرح آپ کی ذاتِ اطہر میں تمام اسبابِ محبت جمع ہیں؛ اس لیے آپ سب سے زیادہ محبت کیے جانے کے مستحق ہیں۔

عشقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار

مگر یاد رہے کہ ایک ہے "محبت" اور ایک ہے "دعویٔ محبت"، دعویٔ محبت سے محبت کا ثبوت نہیں ہو جاتا، جب تک کہ اس کی دلیل یا کم از کم اس کی علامت نہ پائی جائے اور چوں کہ آج کل عشقِ رسول ومحبتِ رسول کے مدعی بے شمار ہیں اور بعض غرض پرست ومفاد پرست لوگ عشقِ رسول کے دعوے سے عوام الناس کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا کرنے اور اپنے مفادات واغراض کے حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں؛ اس لیے ضروری ہے کہ عشقِ نبوی کے علامات وآثار کا ذکر کیا جائے؛ تا کہ لوگ محبت ودعویٔ محبت میں فرق جان لیں اور ہر مدعی کے پیچھے پڑ کر گمراہی وضلالت کا شکار نہ ہو جائیں۔

علما نے لکھا ہے کہ دعوئ محبت میں وہی سچا ہے، جو محبت کی علامتیں بھی اپنے اندر رکھتا ہو۔ حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ ''شفاء'' میں فرماتے ہیں: ''جو کسی چیز سے محبت کرتا ہے، وہ اس کو ترجیح دیتا ہے اور اس سے موافقت کرتا ہے، ورنہ وہ اپنی محبت میں سچا نہیں ہوسکتا؛ بل کہ محض مدعی ہوگا۔ (شفاء: ۲/ ۲۲)

اتباعِ سنت وشریعت

یہاں چند اہم اہم علامتوں کا ذکر کرتا ہوں، تا کہ بات پوری طرح سامنے آجائے ۔لیجیے، سنیے! کہ عشقِ رسول کی ایک اہم اور بڑی علامت یہ ہے کہ اتباعِ سنت وشریعت کا اہتمام ہو، جو شخص جس قدر شریعت کی اتباع کرتا ہے اور سنت کی پیروی کرتا ہے، سمجھا جائے گا کہ اسی قدر محبتِ نبوی وعشقِ نبوی اس کے دل کے اندر ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''بیٹا! اگر تو ایسا کر سکے کہ کسی سے دل میں کوئی کینہ نہ ہو، تو ایسا کرنا، یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت (پر عمل کر کے اس کو) زندہ کیا، اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جو میرے سے محبت رکھتا ہے، وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

(الشفاء: ۲/ ۲۲)

معلوم ہوا کہ محبت وعشقِ رسول کے لیے اتباعِ شریعت واتباعِ سنت لازم و ضروری ہے؛ اگر اس کے بغیر کوئی دعوئ محبت کرتا ہے، تو وہ صحیح نہیں ہے۔

معرفت وطریقت کے نام پر دھوکہ

آج ایک طبقہ معرفت وطریقت اور عشق ومحبت کے نام پر خلافِ شرع وخلافِ سنت بہت سی باتوں کو اختیار کیے ہوئے ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ

شریعت وسنت کے خلاف ہے،تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ معرفت وطریقت کی باتیں ہیں،جن کو شریعت والے سمجھ نہیں سکتے؛ حالاں کہ یہ سراسر گمراہی ہے۔ جو طریقت ومعرفت شریعت کے موافق نہیں،اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''یاد رکھ کہ جس حقیقت وطریقت کی شریعت تائید وتوثیق نہ کرے اور اسے جائز نہ ٹھہرائے وہ صریحاً کفر والحاد ہے''۔ (فتوح الغیب:۱۰۹،مقالہ:۴۰)

حضرت شیخ جیلانی رحمہ اللہ کے ہم عصر دوسرے بزرگ'' حضرت احمد کبیر رفاعی'' رحمہ اللہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''طریقت شریعت کا عین ہے،مگر بعض لوگ اولیاء اللہ پر تہمت لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طریقت الگ ہے اور شریعت الگ ہے''۔ (رموزِ رفاعیہ:۳۰)

غرض یہ کہ جب تک شریعت کا اتباع نہ ہو اور سنتوں کی پیروی نہ ہو وہ اپنے دعویٰ محبت میں سچا نہیں ہوسکتا؛ اگر چہ وہ کچھ عجیب کرتب دکھائے اور حیرت انگیز افعال اس سے سرزد ہوں؛ مگر ان باتوں سے دھوکہ ہرگز نہ کھانا چاہیے۔

ذکر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ آپ کا ذکرِ مبارک کرتا رہے؛ کیوں کہ جو کسی سے محبت کرتا ہے،وہ اس کا ذکر زیادہ سے زیادہ کرتا ہے۔

حضراتِ صحابۂ کرام جب بیٹھتے،تو آپ کا ذکر کیا کرتے،آپ کے افعال و اعمال، آپ کے خصائل وشمائل کا تذکرہ فرماتے؛ مگر یاد رہے کہ یہاں ذکر سے مراد آپ کے نام کی تسبیح پڑھنا نہیں ہے؛ بل کہ مراد یہ ہے کہ جیسے کوئی اپنے شیخ و پیر یا استاذ و باپ کا تذکرہ کرتا ہے،اس طرح آپ کا ذکر ہو،آپ کے واقعات وحالات،

آپ کی سیرت وسنت، آپ کے حسن و جمال، آپ کے فضل وکمال کا ذکر کیا جائے، خواہ وہ کسی جگہ بھی ہو، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی علامت ہے۔

میلاد کر لینا کافی نہیں!!

بعض لوگ جو میلاد کا جلسہ کر کے خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کر دیا، یہ کافی نہیں؛ بل کہ دن رات آپ کا ذکر ہونا چاہیے، کوئی مجلس اس سے خالی نہ ہو جائے اور تمام معاملات وحالات میں آپ کو یاد رکھنا چاہیے، اسی لیے ''حضرت مولانا فضلِ رحمان گنج مراد آبادی'' فرماتے تھے کہ ''لوگ سال میں ایک دفعہ میلاد کرتے ہیں اور ہمارے یہاں تو الحمدللہ روزانہ میلاد ہوتا ہے''۔

کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ ہم ہر وقت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرتے ہیں اور ہر لمحہ آپ کا ذکرِ خیر کرتے ہیں اور میلاد والے، سال میں ایک بار میلاد کا جلسہ کرنے کے بعد کبھی بھول کر بھی آپ کا ذکر نہیں کرتے۔ کیا یہی آپ کا حق ہے، اور کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہو جائیں گے؟

مشابہتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

محبت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ آپ کے ساتھ ہر چیز میں مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرے، صورت میں، سیرت میں، چال چلن میں، ہنسنے اور بولنے میں، کھانے پینے میں، لباس وپوشاک میں۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ چمڑے کی جوتیاں پہنتے تھے اور پیلے رنگ سے رنگتے تھے؛ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کرتے تھے۔ (شفاء: ۲/۲۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جب آپ کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کدو پسند کرتے ہیں، تو وہ بھی کدو کو پسند کرنے لگے۔ (شمائلِ ترمذی:۱۰)

حضرت حسن بن علی، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم ایک دفعہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں وہ کھانا پکا کر دیجیے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا۔ (شمائلِ ترمذی:۱۱)

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کا کمالِ اتباع

حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ حج کیا اور حج کے بعد واپسی میں ہم لوگ ساتھ تھے، آپ اونٹ پر سوار ہوئے اور چلتے رہے اور ہم بھی ساتھ چلتے رہے، درمیان راستے میں ایک جگہ اونٹ والے سے کہا کہ اونٹ کو بٹھا دو، اس نے اونٹ کو بٹھا دیا، آپ اترے اور ذرا دور چلے گئے؛ پھر ایک جگہ اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی پیشاب کرنے بیٹھتا ہے، اس کے بعد واپس آئے اور فرمایا کہ چلو۔ حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا کہ حضرت ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ آپ نے پیشاب کیا ہے، تو وضو بھی کریں گے اور دو چار رکعتیں پڑھیں گے، فرمایا کہ میں نے تو پیشاب نہیں کیا، میرا تو وضو ہے، اس پر لوگوں کو اور تعجب ہوا، تو عرض کیا کہ حضرت! آپ نے تو ابھی ادھر جا کر پیشاب کیا تھا، کہا کہ نہیں! بل کہ بات یہ ہے کہ میں ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی راستے پر سے گزر رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشاب کی ضرورت ہوئی اور آپ نے اسی جگہ پیشاب فرمایا تھا، جہاں میں جا کر بیٹھا تھا، مجھے اس وقت پیشاب تو نہیں آیا؛ مگر میں نے سوچا کہ آپ کی اس میں بھی اتباع کروں؛ لہٰذا مشابہتِ

نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صرف وہاں جا کر بیٹھ کر آ گیا۔

(مفتاح الجنة : ۴۰۳۹)

یہ ہے محبت کا کرشمہ اور اس کو عشق کہتے ہیں کہ اتباع و مشابہتِ نبوی کامل طور پر ہو اور ہر ہر چیز میں ہو۔

خلاصۂ کلام

غرض یہ کہ دعویٔ محبت کافی نہیں؛ بل کہ ان علامات کے ذریعے ثبوت دینا بھی ضروری ہے۔آج دعویٔ محبت کرنے والے ایسے ہیں کہ جو بدعات وخرافات اور جاہلی رسومات اور من مانی محدِثات سے اپنی زندگی کو آراستہ کرتے اور سنتوں اور شرعی احکام سے بغاوت کرتے ہیں اور سنت وتوحید کا نام لینے والوں کے دشمن ہو جاتے اور ان کو بدنام کرنے کی سازش وکوشش کرتے ہیں، جو تحریکیں اور جماعتیں دین کی خدمت ونصرت، حمایت واشاعت، تبلیغ ودعوت کا کام کرتی ہیں، جیسے تبلیغی جماعت، اور دیوبندی مکتبِ فکر کے علما ان کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لہٰذا عوام کو چوکنا رہنا چاہیے اور محض دعویٔ محبت سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ عاشق ہو گیا ہے، جب کہ وہ دین وشریعت پر نہیں چلتا اور دینی وتبلیغی کام کو بھی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین۔
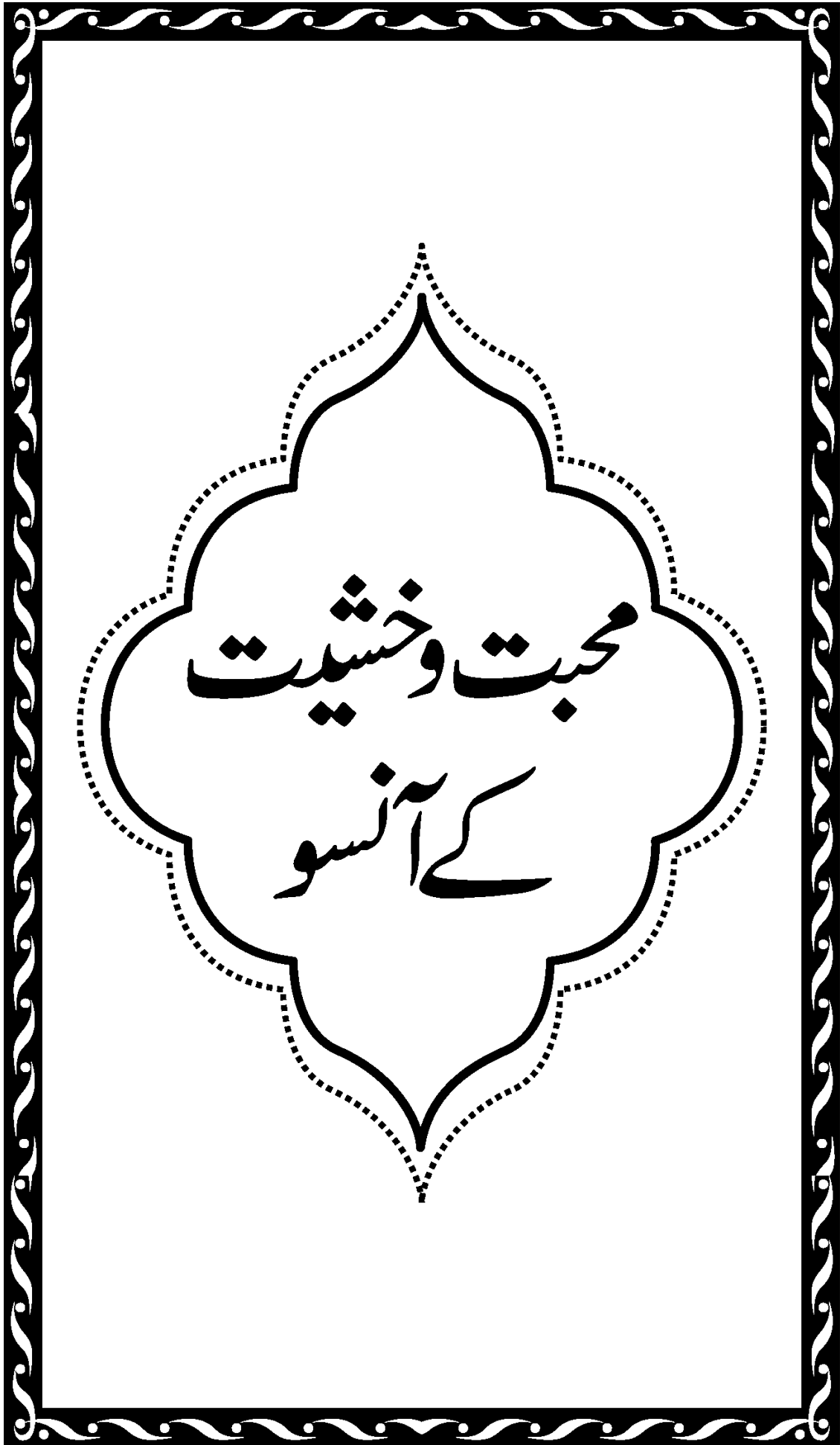
محبت وخشیت
کے آنسو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محبت وخشیت کے آنسو

اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت یا خشیت سے رونا ایک عظیم عبادت اور مقدس عمل ہے اور جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، اسے یہ دولت نصیب ہوتی ہے؛ پھر اس رونے پر آنکھوں سے نکلنے والے آنسوں بھی مقدس اور قابلِ قدر ہو جاتے ہیں۔

محبتِ الٰہیہ میں رونے کی فضیلت

اللہ کی محبت میں رونے کی فضیلت اُس حدیث میں آئی ہے، جس میں سات قسم کے لوگوں کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایے میں جگہ ملنے کی بشارت سنائی گئی ہے، ان سات خوش قسمت لوگوں میں ایک وہ ہے، جس کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا: "**رجل ذكر الله خالياً ففاضت عيناه**" (وہ آدمی، جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں بہہ گئیں)۔ **(بخاري : ٦٢٩)**

اس حدیث میں خدا کو یاد کر کے رونے کا ذکر ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ رونا ذاکر کے حال اور اس کو جو مکشوف ہوتا ہے، اس کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ جلالِ خداوندی اگر مکشوف ہوا، تو رونا اللہ کی خشیت وخوف سے ہوگا اور اگر اوصافِ جمال کا مشاہدہ ہوا، تو رونا، محبت وشوق کی وجہ سے ہوگا۔

(فتح الباري : ٢ /١٤٧، عمدة القاري : ٥/ ١٧٩)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے اوصافِ جمال کے مکشوف ہونے پر اللہ کی محبت اور اس کے شوقِ دیدار میں رونا بڑا بھاری عمل اور مقدس عبادت ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

مولانا رومی رَحِمَہُ اللہُ نے اپنی مثنوی میں ذکر کیا ہے کہ ایک بزرگ اللہ کی محبت میں رویا کرتے تھے اور شوقِ دیداران کو بے چین و مضطرب کیے ہوئے تھا، ان کے ایک رفیقِ طریق نے ان کو نصیحت کی اور کہا کہ اتنا نہ رویا کرو، ورنہ کہیں آنکھوں مین خلل وخرابی نہ آجائے۔

مولانا رومی رَحِمَہُ اللہُ اس کو نقل کرتے ہیں:

زاہدے را گفت یارے درعمل ☆ کم گری تا چشم را نیاید خلل

اس پر زاہد و عابد و عاشق نے جواب دیا کہ ”دیکھو بھائی! دو حال سے خالی نہیں یا تو اس رونے اور گریہ وزاری کی وجہ سے آخرت میں جمالِ خداوندی مجھے نصیب ہوگا یا یہ کہ ان آنکھوں کو یہ دولت نصیب نہ ہوگی، اگر رونے سے جمالِ خداوندی نصیب ہوجاتا ہے، تو ان آنکھوں کے نہ رہنے اور خراب ہوجانے کا کیا غم؟ اللہ کے وصال و دیدارِ جمال کے لیے دو آنکھیں کیا، لاکھوں آنکھوں کو بھی قربان کیا جاسکتا ہے اور اگر خدانخواستہ میری بدبخت آنکھوں کو جمالِ حق کا دیکھنا نصیب نہ ہوا تو ان بدبخت آنکھوں کا پھوٹ جانا ہی بہتر ہے، وہ آنکھ ہی کیا، جو جمالِ یار کے دیکھنے کے قابل نہ ہو“؟۔

مولانا رومی رَحِمَہُ اللہُ زاہد کا یہ جواب نقل کرتے ہیں:

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال ☆ چشم بیند یا نہ بیند آں جمال

گر بہ بیند نورِ حق خود چہ غم است ☆ در وصالِ حق دو دیدہ کے کم است

ورنہ بیند نورِ حق را گو برو! ☆ ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

ایک عاشقِ خدا کا گریہ وبُکا

امام غزالی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''مکاشفۃ القلوب'' میں حکایت لکھی ہے کہ حضرت ذوالنون مصری رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں کہ ایک دن میں خانۂ کعبہ میں داخل ہوا، تو ستون کے قریب ایک برہنہ نوجوان مریض کو پڑے دیکھا، جس کے دل سے رونے کی آواز نکل رہی ہے، میں نے اس کے قریب جا کر اسے سلام کیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں ایک غریب الوطن عاشق ہوں، میں اس کی بات سمجھ گیا اور میں نے کہا کہ میں بھی تیری طرح ہوں، وہ رونے لگا، اس کا رونا دیکھ کر مجھے بھی رونا آگیا، اس نے مجھے دیکھ کر کہا کہ تم کیوں رو رہے ہو؟ میں نے کہا کہ اس لیے رو رہا ہوں کہ تیرا اور میرا مرض و بیماری ایک ہے، اس نے چیخ ماری اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

یہ ہے خدا کی محبت اور عشق کا رونا، جس پر وعدہ ہے کہ خدا تعالیٰ ایسے شخص کو قیامت کے دن اپنے سائے میں جگہ دے گا۔

خوفِ خدا سے رونے کی فضیلت

اور خوف وخشیت سے رونا بھی فضیلت والا عمل ہے؛ چناں چہ حضرت ابوامامہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ

" لَیْسَ شَيْءٌ أَحَبَّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ قَطْرَتَیْنِ: قَطْرَۃِ دُمُوْعٍ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ وَقَطْرَۃِ دَمٍ یُھْرَاقُ فِيْ سَبِیْلِ اللّٰہِ". (اللہ کے نزدیک کوئی شی دو قطروں سے زیادہ پیاری نہیں، ایک آنسو کا قطرہ، جو اللہ کے خوف و ڈر سے نکلے اور دوسرے خون کا قطرہ، جو اللہ کے راستے میں بہایا جائے) (ترمذي، مشکوٰۃ: ۳۳۳)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ”کوئی مؤمن بندہ ایسا نہیں کہ اس کی آنکھوں سے خوفِ خدا کی وجہ سے آنسو نکلے، اگر چہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہی (چھوٹا) کیوں نہ ہو؛ پھر اس آنسو سے اس کے چہرے پر کچھ حصہ لگ جائے؛ مگر اللہ اس کو دوزخ پر حرام کر دیتے ہیں۔ (مشکوٰۃ: ۴۵۸)

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے خوف وڈر سے جو آنسو نکلتا ہے، وہ اللہ کی نظر میں اس قدر قیمتی ہوتا ہے کہ اس کا کوئی بھی حصہ اگر چہرے پر لگ جائے، تو وہ چہرہ بھی قیمتی ومبارک ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کو حرام کر دیتے ہیں۔

یاد رہے کہ مراد چہرے سے مؤمن کی ذات ہے کہ اس آنسو کی وجہ سے اس کی ذات کو دوزخ پر حرام کر دیا جاتا ہے۔

ایک عجیب نکتہ

اس حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ ” حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ “ (کہ اللہ اس مؤمن پر دوزخ کو حرام کر دیتا ہے) بل کہ یہ فرمایا کہ ” حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ “ (کہ اس مؤمن کو دوزخ پر حرام کر دیتا ہے) مؤمن پر دوزخ کے حرام ہونے اور دوزخ پر مؤمن کے حرام ہونے میں بڑا فرق ہے۔ مؤمن پر دوزخ کے حرام ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ مؤمن دوزخ میں نہ جائے گا؛ کیوں کہ اس پر دوزخ حرام کر دی گئی ہے اور دوزخ پر مؤمن کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن اگر دوزخ میں کسی وجہ سے ڈال بھی دیا جائے، تب بھی دوزخ پر حرام ہے کہ وہ اس کو جلائے یا اذیت پہنچائے؛ لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈر کر رونے والے مؤمن کو دوزخ میں نہ ڈالا جائے گا؛ لیکن اگر بفرضِ محال یا کسی وجہ سے ایسا مؤمن دوزخ میں ڈال بھی دیا جائے، تب بھی اس کو دوزخ نہ جلائے گی۔

شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کا واقعہ

معلوم ہوا کہ یہ خوفِ خدا کے آنسو کا قطرہ بہت ہی قیمتی دولت ہے اور اس کو چہرے پر مل لینا چاہیے۔ ”حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ “جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ گذرے ہیں، ان کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ روتے وگڑگڑاتے اور جو آنسو کے قطرے نکلتے ان کو اپنے چہرہ پر مل لیتے تھے۔

بعض لوگ رومال سے ان آنسوؤں کو پوچھ لیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ ایسا کرنے کے بجائے ان قطروں کو منہ پر، ہاتھ پر یا اور کسی عضو پر مل لینا چاہیے تا کہ ان قطرات سے جہنم کی آگ پر یہ اعضاء حرام ہو جائیں۔

ایک عجیب وحیرت زدہ واقعہ

بعض علما سے یہ واقعہ جو بڑا عجیب وحیرت زدہ ہے سنا گیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے دور میں ایک شخص مسافر کہیں جا رہا تھا، راستے میں کسی شخص کو نزع کے عالم میں دیکھا اور مرنے کے بعد اس کی تجہیز وتکفین میں شریک رہا اور خود قبر میں اُتر کر اس کو قبر میں رکھا، اس کے بعد اس کو اندازہ ہوا کہ اس کے جیب سے روپیوں کی تھیلی غائب ومفقود ہے۔ خیال ہوا کہ شاید تدفین کے وقت قبر میں گر گئی ہوگی؛ اس لیے قبر کو کھودنے کا ارادہ کیا اور کھودنا شروع کیا، تو دیکھتا کیا ہے کہ قبر آگ کے شعلے بھڑکا رہی ہے اور اس آگ کا اس کے ہاتھ پر بھی اثر ہوا، جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں بے انتہا سوزش وجلن پیدا ہوگئی، جو ناقابلِ برداشت وتحمل تھی، اس نے اس کا علاج بھی کرایا، مگر تمام اطبا، حکما اور ڈاکٹر عاجز آگئے، کسی کا علاج کارگر نہ ہوا، ایک زمانہ اسی بے قراری وبے چینی واضطراب

وپریشانی میں گذر گیا، کسی نے اس کو مشورہ دیا کہ تم دہلی جاؤ، وہاں اس زمانے کے سب سے بڑے عالم وبزرگ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی رَحِمَہُ اللہُ ہیں، ان سے دعا کراؤ۔ وہ شخص اس مشورے پر دہلی حضرت کی خدمت میں گیا اور سارا واقعہ سنایا، اس پر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رَحِمَہُ اللہُ نے فرمایا کہ قبر میں جس آگ سے تیرا ہاتھ جلا ہے، وہ دنیا کی آگ نہیں؛ بل کہ آخرت کی اور جہنم کی آگ ہے، جہنم کی آگ کا علاج دنیا کی دوائیاں اور دنیا کے حکیم وڈاکٹر نہیں کر سکتے، اس آگ کا علاج صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اللہ سے اپنے گناہوں پر استغفار کر اور اس کے سامنے خوب گڑگڑا کر رو اور آنکھوں سے جو آنسوں نکلیں، وہ اپنے اس جلے ہوئے ہاتھ پر لگا؛ کیوں کہ حدیث میں ہے کہ جہنم کی آگ خدا کے خوف سے رونے سے بجھ سکتی ہے؛ چناں چہ اس آدمی نے ایسا ہی کیا، تو دیکھا کہ وہ سوزش اور جلن ختم ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ یہ آنسو کے قطرے بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔

خوفِ خدا سے رونے کے واقعات

خوفِ خدا سے رونے والے حضرات کے واقعات ہمارے لیے بڑے عبرت خیز بھی ہیں اور دلوں کو نرم کرنے والے بھی ہیں؛ اس لیے کبھی کبھی ان کے اس طرح کے حالات سننا بھی چاہیے۔

ایک بار خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک شخص کو دیکھا، جس نے بہت لمبا سجدہ کیا، جب اس نے سر اُٹھایا، تو اس کے سجدے کی جگہ آنسوؤں کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھی، خلیفہ نے ایک آدمی کو وہاں نگرانی کرنے کھڑا کر دیا اور کہا کہ جب یہ فارغ ہو جائے، تو میرے پاس لانا تا کہ میں اس کی عقل کا امتحان لوں۔ الغرض! جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو بادشاہ کے سامنے لایا گیا، بادشاہ نے کہا کہ میں نے تجھ سے

ایک ایسی بات دیکھی ہے کہ جنت تو اس کے بغیر بھی مل سکتی ہے؟ (یعنی اتنا رونے کی کیا ضرورت ہے، جب کہ اس کے بغیر بھی جنت مل سکتی ہے؟) اس شخص نے ایک زور کی چیخ ماری، جس سے بادشاہ بھی خوف زدہ ہو گیا؛ پھر وہ شخص بے ہوش ہو گیا ؛ پھر بہت دیر بعد اس کو ہوش آیا، تو وہ اپنے چہرے سے پسینہ پوچھ رہا تھا اور اللہ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اے اللہ! تیری نافرمانی کرنے والا ہلاک ہو، جب تک کہ وہ آپ کے پاس گناہ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے، اس کا یہ خوف دیکھ کر بادشاہ بھی رونے لگا؛ مگر وہ شخص پیٹھ پھیرے ہوئے کھڑا رہا، یہاں تک کہ نکل گیا۔

(الرقۃ والبکاء: ۱۹۰)

ابن ابی الدنیا رَحِمَہُ اللہُ نے یہ بھی حیرت ناک واقعہ لکھا ہے کہ ابوعمر کہتے ہیں کہ میں وراد عجلی کو دیکھا کرتا تھا کہ وہ مسجد، سر کو رومال سے ڈھک کر آتے اور ایک کونے میں کھڑے ہو کر مسلسل نماز پڑھتے، دعا کرتے اور روتے رہتے ؛ پھر مسجد سے نکلتے اور ظہر میں آتے اور اسی طرح نماز و دعا اور بکا میں لگے رہتے ، یہاں تک کہ عشا ہو جاتی؛ پھر مسجد سے نکلتے ، نہ کسی سے بات چیت کرتے اور نہ کسی کے پاس بیٹھتے۔ ابوعمر کہتے ہیں کہ میں نے ان کے محلے کے ایک آدمی سے ان کے بارے میں پوچھا، تو اس نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ یہ وراد عجلی ہیں، جنھوں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ جب تک اللہ کو قیامت میں دیکھ نہیں لیں گے اس وقت تک نہیں ہنسوں گا۔ (الرقۃ والبکاء: ۱۹۲)

حضرت مالک بن ضیغم رَحِمَہُ اللہُ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت حکم بن نوح نے میرے والد ابو مالک کے بارے میں کہا کہ ایک رات آپ کے والد اول سے آخر تک روتے ہی رہے، جس میں نہ کوئی سجدہ کیا نہ رکوع کیا، جب صبح ہوئی، تو ہم نے کہا کہ اے ابو مالک! پوری رات میں آپ نے نہ نماز پڑھی نہ دعا کی؟ تو وہ رونے

لگے اور کہا کہ اگر مخلوقات یہ جان لیں کہ کل وہ کس چیز کا سامنا کرنے والے ہیں، تو کسی عیش کی چیز میں ان کو لذت نہ ملے، خدا کی قسم! میں نے جب رات کو، اس کی ہول ناکی اور اس کی تاریکی کی شدت دیکھی، تو قیامت اور اس کی شدت و ہولنا کی یاد آ گئی، جہاں ہر نفس اپنے آپ میں مشغول ہوگا، نہ کوئی باپ بیٹے کے کام آئے گا اور نہ بیٹا باپ کے کچھ کام آئے گا۔ یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئے اور مسلسل کانپتے رہے؛ پھر جب کچھ سکون ہوا، تو ان کو اٹھا کر لے گئے۔ (الرقة والبکاء: ۲۰۳)

اللہ والوں کے یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ ان حضرات کو اللہ کا کس قدر خوف تھا اور آخرت کی کس قدر فکر تھی، جس کی وجہ سے رات رات بھر وہ بے چین رہتے اور روتے اور گڑگڑایا کرتے تھے۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا

حدیث میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ دعا بھی آئی ہے، آپ فرماتے ہیں:

"اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِيْ عَيْنَيْنِ ھَطَّالَتَيْنِ تَسْقِيَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْيَتِکَ قَبْلَ اَنْ تَکُوْنَ الدُّمُوْعُ دَمًا وَّالْأَضْرَاسُ جَمْراً"

(الحزب الأعظم)

(اے اللہ! مجھے دو ایسی آنکھیں عطا فرما دیجیے، جو بہت زیادہ برسنے والی (یعنی رونے والی) ہوں، جو آپ کے خوف سے آنسو بہا کر دل کو سیراب کر دیں، اس سے پہلے کہ آنسو (قیامت کے ہولناک منظر سے) خون بن جائیں اور داڑھیں آگ بن جائیں

اس عجیب دعا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی آنکھیں، اللہ سے مانگی ہیں کہ جو خوب رونے والی ہوں اور یہ رونا اللہ کے ڈر و خوف کی شدت سے ہو، اس

کے ساتھ اس دعا میں بعض حیرت انگیز اشارات بھی ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ اللہ کے ڈر سے رونے سے دل کو سیرابی نصیب ہوتی ہے، " تسقیان القلب" میں اس کی طرف اشارہ ہے، بعض روایات میں " تشفیان القلب" آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ "دل کو شفا دینے والی آنکھیں عطا فرما"، یہ شفا سے ماخوذ ہے اگر اس روایت کو لیا جائے، تو اس میں اشارہ ہے کہ اللہ کے ڈر سے رونا دل کی بیماریوں کے لیے شفا ہے، اگر دل گناہ کا عادی ہے، تو اللہ کے ڈر سے رو کر تو دیکھو کہ اس میں کیسا جِلا پیدا ہوتا ہے۔ پہلی روایت پر سیراب کرنے والی آنکھوں سے مراد یہ ہے کہ رونے سے دل اللہ کی عظمت اور خوف وخشیت سے لبریز ہوتا اور اس کے اثرات سے سیراب ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ قیامت کی ہولناکی وخوفناکی ایسی ہوگی کہ آنکھ سے آنسوؤں کی جگہ خون نکلے گا؛ جیسے محاورے میں بھی کہا جاتا ہے کہ "خون کے آنسو روؤ گے" دنیا میں تو یہ مجاز ہے اور قیامت میں حقیقت؛ اس لیے آپ نے دعا کی کہ اس دن کے آنے سے پہلے کہ رونا بھی چاہیں، تو آنسو نہ نکلے، ہم کو ایسی آنکھیں عطا فرمادے، جو خوب رونے والی ہوں، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں آدمی کو اللہ کے ڈر سے خوب رو لینا چاہیے کہ بعد میں یہ موقعہ نہ ملے گا۔

(۳) تیسرے یہ کہ قیامت میں دوزخ کا عذاب ایسا سخت ہوگا کہ ڈاڑھی، دوزخ کی آگ میں جل کر خود آگ بن جائیں گے، آپ نے دعاء کی کہ اس واقعہ کے آنے سے پیشتر رونے والی آنکھیں عطا فرمادے، تاکہ گناہ پر رو رو کر یہیں گناہ صاف ہوجائیں۔ ہر مسلمان کو یہ دعا کرنا چاہیے اور اس کے مطابق رونا بھی چاہیے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اللہ تک
پہنچنے کے لیے
دنیا چھوڑنا
ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تک پہنچنے کے لیے دنیا چھوڑنا ضروری نہیں!

الحمد للّٰہ و کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ أمابعد:

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم .بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ﴾ (النور:۳۷)

یہ آیتِ کریمہ قرآن کریم کی ایک آیت کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اللہ کے کچھ مخصوص بندے ایسے بھی ہیں، جن کو ان کی تجارت اور ان کے دنیوی کاروبار اللہ کے ذکر سے ، نماز سے ، زکوۃ سے غافل نہیں کرتے''؛ حالاں کہ وہ دنیا کا کام کرتے ہیں، دنیا کے معاملات کرتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود نہ ذکر سے غافل ہوتے ہیں، نہ نماز سے غافل ہوتے ہیں، نہ زکوٰۃ سے غافل ہوتے ہیں۔

اللہ کی یاد ان کے سینوں کے اندر ہر وقت ایسی موج زن ہوتی ہے، جیسے کہ سمندر کا پانی موج زن ہوتا ہے، دنیوی کوئی کاروبار، دنیوی کوئی معاملہ ان کو اس سے غافل نہیں ہونے دیتا۔

مَردوں کی دو قسمیں-ایک نکتہ

یہ اولیاء اللہ کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان کیا ہے، یہ اللہ کے مخصوص بندے ہیں، یہاں پر قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کہا ''رِجَالٌ''

رجال ''رجل'' کی جمع ہے، جس کے معنے ''مرد'' کے آتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی نظر میں مرد یہی ہیں، باقی سب نامرد ہیں۔

جیسے کہتے ہیں کہ دیوبند میں ایک دیوانی تھی اور وہ گلی کوچوں میں بالکل ننگی پھرا کرتی تھی؛ لیکن اگر کسی گلی میں چلتے چلتے اس کے راستے میں حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ ایک طرف سے آجاتے، تو فوراً پردہ کر لیتی اور کپڑا اپنے بدن پر ڈال لیتی اور کہتی کہ ''مرد آرہا ہے، مرد آرہا ہے'' گویا اس دیوانی کی نظر میں پورے دیوبند میں مرد ایک ہی تھے، باقی جتنے بھی تھے، سب نامرد تھے، اس لیے ان سے تو پردہ کرتی تھی، باقی سب کے سامنے ننگی پھرا کرتی تھی۔

تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص و مقرب بندوں کو ''رجال'' کہا ہے، یہ بتانے کے لیے کہ حقیقت میں یہی لوگ مرد ہیں، جو ایسے مضبوط ہوتے ہیں کہ دنیا کے سارے کاروبار کرتے ہوئے بھی اپنے خدا سے کبھی غافل نہیں ہوتے، یہ اصلی مرد ہیں۔

مرد بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک اصلی مرد اور ایک نامی گرامی مرد، یعنی نام کے مرد۔ اللہ کی نظر میں اصلی مرد وہی ہیں، جن کو دنیا کی کوئی طاقت، دنیا کا کوئی کاروبار اور بیوی، بچے دنیا کی اور چیزیں، یہ سب کی سب مل کر بھی اللہ سے غافل ہونے نہیں دیتیں۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے ہزاروں راستے ہیں

اسی لیے حضراتِ صوفیائے کرام کہتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے ایک ہی راستہ مقرر نہیں؛ بل کہ بزرگوں کا ارشاد ہے کہ تمام انسانوں کی جتنی سانسیں ہیں، خدا تک پہنچنے کے لیے اتنے ہی راستے اور طُرق ہیں۔ انسان کی سانسوں کی کیا تعداد

ہے؟ ایک دن میں ایک آدمی چوبیس ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے، ہر آدمی چوبیس ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے اور دنیا میں کروڑوں انسان ہیں، کروڑوں انسانوں کی ہر روز کی سانسیں اور پھر ایک ایک انسان کی اتنی لمبی لمبی عمر، تو کتنا حساب بیٹھے گا؟ اس میں کوئی تعداد ہم بیان نہیں کر سکتے؛ بل کہ اس کا اندازہ بھی ہم صحیح طور پر نہیں کر سکتے؛ اس لیے دنیا کی کوئی چیز انسان کو خدا سے غافل کر ہی نہیں سکتی؛ بل کہ ہر چیز کے اندر سے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تک پہنچنے کے لیے ایک تو وہ چیزیں مقرر ہیں، اللہ کی طرف سے جو ضروری ہیں، جیسے نماز، زکوۃ، روزہ اور کچھ مخصوص چیزیں، وہ اپنی جگہ پر ہیں؛ لیکن اس کے علاوہ ہر چیز میں انسان اللہ تعالیٰ کا راستہ پانے کے لیے سبیل تلاش کر سکتا ہے اور کوئی چیز اس کو غافل نہیں کرے گی؛ بل کہ اللہ تک پہنچا دیگی۔

تو اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ حضرات مختلف کاروباری ہیں، مختلف مصروفیات کے ہیں، کوئی پڑھنے پڑھانے والا ہے، کوئی قرآن پڑھاتا ہے، کوئی حدیث پڑھاتا ہے، کوئی کچھ پڑھاتا ہے اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جو تاجر پیشہ ہیں، کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جو ملازمت پیشہ ہیں؛ مگر ہم سب کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا کا یا دین کا کوئی معاملہ ہم کو خدا سے غافل نہ کر دے۔ دینی معاملے کے غافل کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، وہ تو غافل کرنے نہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے ہی کے لیے ہے۔

دینی خدام میں دو چیزوں کی کمی

ایک اہم بات ہے، وہ یہ کہ مثلاً ایک آدمی قرآن پڑھاتا ہے، حدیث پڑھاتا ہے، فقہ کا درس دیتا ہے، یا اور کوئی دینی خدمت کرتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود ہو سکتا

ہے کہ اس کے ذریعے وہ خدا تک نہ پہنچے۔

اور ایک آدمی کاروبار کرتا ہے، منڈی میں تجارت کرتا ہے؛ لیکن ہوسکتا ہے کہ منڈی کا وہ تاجر خدا تک پہنچ جائے۔ ایک آدمی قرآن پڑھا کر جہنم میں جاسکتا ہے اور ایک آدمی تاجر ہوکر جنت میں جاسکتا ہے، وہ کیسے؟

اس کی دو وجہ ہیں، ایک وجہ ''نیت کا فرق اور اخلاص کا فقدان'' اور ایک وجہ ''اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہونا'' یہ دو وجوہات ہوتی ہیں عام طور پر، جس کی وجہ سے نیک کام کرکے بھی ایک آدمی جہنم رسید ہو جاتا ہے اور یہ دو باتیں آج کل عموماً دینی خدام میں پائی جاتی ہیں؛ اس لیے میں نے عرض کر دیا کہ یہاں بھی ماشا اللہ دینی خدام جمع ہیں اور طالبِ اصلاح بھی ہیں، اگر یہ اصلاحی باتیں اب نہ کہی جائیں تو پھر ان مجالس کا کیا فائدہ؟

نیت کا فتور اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد

نیت کا فرق وفتور کیا ہے؟ مثال کے طور پر ایک آدمی قرآن پڑھا رہا ہے؛ لیکن اس کی نیت یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کو پہچانے، اللہ کو پائے؛ بل کہ اپنے کسی دنیوی مفاد کے لیے پڑھا رہا ہے، یہ اخلاص کا فقدان ہے اور نیت کا فتور ہے۔

اسی لیے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ایک موقعے پر دارالعلوم میں تقریر فرمائی تھی اور وہ تقریر حضرت کی چھپی ہوئی ہے۔ اس میں حضرت فرماتے ہیں کہ میں اپنی پوری زندگی کے مطالعے کے بعد وہ تمام بزرگانِ دین، جن کی خدمت میں اللہ نے مجھ کو پہنچایا، ان کی صحبتوں کو پانے کے بعد اور ان کے اقوال وارشادات اور ان کے ملفوظات کی روشنی میں، جو کچھ مجھے دین سمجھ میں آیا، اس دین کی روشنی میں میں یہ کہتا ہوں کہ ''اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے اس کام کے لیے

قبول کیا ہے، تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں؛ بشرطیکہ یہ اللہ کے لیے ہو اور اس سے بدتر بھی کوئی مشغلہ نہیں ہے؛ بشرطیکہ یہ دنیا کے لیے ہو۔

کیا خوب جملہ فرمایا!؟ عجیب وغریب جملہ ہے، کہ دین کی خدمت سے بہتر بھی کوئی چیز نہیں ہے؛ بشرطیکہ اللہ کے لیے ہو، اس سے بدتر بھی کوئی چیز نہیں ہے؛ بشرطیکہ وہ دنیا کے لیے ہو جائے۔

موٹی سی مثال ہے کہ ایک عالی شان، بہترین کپڑا ہے۔ فرض کیجیے کہ ریشم کا کپڑا ہے، اس ریشم کے کپڑے کو اگر کوئی شخص اپنے جوتوں کی دُھول پونچھنے کے لیے کام میں لایا کرے، تو کیا کوئی آدمی یہ کہے گا کہ بڑا اچھا کام کیا ہے؟ سب اس کو کہیں گے کہ بے وقوف ہے، پاگل ہو گیا ہے۔ اسی طرح دین ریشم کے کپڑے کی طرح ہے؛ بل کہ اس سے بھی اعلیٰ درجے کی چیز ہے؛ اگر کوئی اس کو دنیا کے لیے استعمال کر رہا ہے، تو وہ بھی بے وقوف ہے؛ اس لیے کہ کوئی ریشم کے کپڑے کو جوتوں کی دھول پونچھنے میں استعمال نہیں کر سکتا، اسی طریقے پر قرآن وحدیث کو پڑھانے کا سلسلہ دنیا کی کمائی کے لیے نہیں ہو سکتا۔

اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی معمولی کپڑے کو استعمال کرے، کسی اچھی چیز کی دھول کو پونچھنے کے لیے، تو کہیں گے کہ بھائی! شاباش، اچھی بات ہے۔ آپ کا کمپیوٹر رکھا ہوا تھا یا اور کوئی چیز رکھی ہوئی تھی، فریج رکھا ہوا تھا، آپ نے ایک معمولی سا کپڑا، جو کسی کام کے قابل نہیں، اس غیر پسندیدہ کپڑے کو اٹھا کر اس کی دھول پونچھنے کے لیے استعمال کیا تو یہ کام ٹھیک کیا ہے۔

اسی طریقے پر دنیا اللہ کی نظر میں ایک بے حیثیت چیز ہے، بے وقعت چیز ہے، دنیا کو دین کے لیے استعمال کیا جائے، تو بہت اچھی بات ہے؛ لیکن دین کو اگر دنیا

کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تو وہ بدترین چیز ہو جاتی ہے؛ اس لیے حضرت نے یہ جملہ فرمایا تھا۔ تو ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ نیت ٹھیک نہیں آدمی کی۔

ذمہ داری کا احساس نہ ہونا

اور دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ ذمہ داری کا احساس نہیں، جس کام پر لگا ہے، اس کا احساس نہیں ہے کہ مجھے کیا کام میں اللہ نے لگایا ہے، کیسے اعلیٰ کام میں لگایا ہے، اشرف ترین کام میں لگایا ہے، کیسے انتہائی مہذب، محترم کام میں اللہ نے لگایا ہے۔ جب اس کو مہذب، محترم، اشرف، مشرف، معظم سمجھے گا، تو اس کے شایانِ شان خدمت بھی کرے گا۔ اگر اس کے شایانِ شان خدمت نہیں ہو رہی ہے، تو یہ ہمارا ایسا قصور ہے، جس کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ اس سے محروم کر دے۔

یہ دو وجہ ہوتی ہیں، تو میں کہہ رہا تھا کہ دین کی خدمت کے ہونے کے باوجود ہوسکتا ہے کہ کوئی اللہ کو نہ پائے اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا کا کاروبار کرنے والا اس کے ذریعے اللہ کو پالے۔

تاجر ولی بن سکتا ہے۔ شیخ منکدر رحمہ اللہ کا واقعہ

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے ''احیاء العلوم'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ بغداد کے علاقے میں ایک شخص رہتے تھے، جن کا نام تھا ''شیخ منکدر'' اور ان کی ایک دکان تھی، تجارت پیشہ آدمی تھے، انھوں نے اپنے خادموں سے ایک دفعہ کہہ دیا کہ بھائی دیکھو! یہ کپڑا اتنے کا ہے اور وہ کپڑا اتنے کا ہے، یہ لبادہ اتنے کا ہے، فلاں لبادہ اتنے کا ہے۔ اس سے زیادہ قیمت میں فروخت نہ کرنا اور ایک کپڑے کے بارے میں بتایا کہ یہ دو دینار کا ہے، اور ایک کے بارے میں کہا کہ یہ تین دینار کا ہے، اس طرح

تاکید کردی۔

ایک مرتبہ اپنے کسی کام سے جا رہے تھے، راستے میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی، جو اعرابی و دیہاتی تھا، دیکھا تو اس کے پاس ایک لبادہ ہے، انھوں نے پوچھا کہ بھائی! یہ لبادہ کہاں سے خریدا؟ تو اس نے کہا کہ ادھر ایک دکان ہے وہاں سے خریدا ہے؛ پھر پوچھا کہ کتنے میں خریدا؟ تو اس نے کہا کہ میں نے تین دینار میں خریدا ہے، تو انھوں نے اسے لے کر الٹ پلٹ کر کے دیکھا اور اس کے بعد میں کہا کہ یہ تو دو دینار کا ہے، تم نے تین دے دیے، ایک دینار تم نے زائد دے دیا ہے؛ اس لیے چلو اس کو واپس کر دو، یا تو اپنی قیمت واپس لے لو یا نہیں تو اپنا ایک دینار واپس لے لو۔

تو اس نے کہا کہ آپ کون ہیں؟ انھوں نے کہا کہ میں اسی دکان کا مالک ہوں، تو شیخ منکدرؒ اس دیہاتی کو لے کر واپس پہنچے اور اپنے خادم سے کہا کہ تم نے یہ غلط حرکت کیوں کی؟ اس کا ایک دینار واپس کر دو یا نہیں تو اسے تین دینار والا لبادہ دے دو۔ خادم نے اس شخص سے پوچھا کہ کیا چاہتے ہیں؟ اس دیہاتی نے کہا کہ ایک دینار واپس کر دو؛ چناں چہ ایک دینار واپس کر دیا گیا اور وہ دیہاتی واپس جانے لگا، چلتے چلتے کچھ آس پاس کے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی یہ کون صاحب ہیں، بڑے امانت دار معلوم ہوتے ہیں کہ ایسا ایسا واقعہ میرے ساتھ پیش آیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ آپ نہیں جانتے ان کو؟ یہ ''شیخ منکدرؒ'' ہیں۔

تو اب اس دیہاتی نے کہا کہ اچھا یہ ہیں شیخ منکدرؒ، ہم لوگ اپنے علاقے میں جب کبھی بارش بند ہو جاتی ہے، تو شیخ منکدرؒ کا واسطہ دے کر دعائیں مانگا کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم کو بارش دے دیتا ہے، اس نے کہا یہ تو وہ آدمی ہیں، مجھے پتہ نہیں تھا اور کہنے لگا کہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ شیخ منکدرؒ کوئی صاحبِ جبہ و دستار

شخصیت ہوگی، جو کسی خانقاہ میں بیٹھ کر تسبیح گھماتے ہوں گے؛ لیکن یہاں آ کر پتہ چلا کہ یہ تو تاجر آدمی ہیں، تجارت کر رہے ہیں؛ لیکن مقام ایسا ہے اللہ کے نزدیک کہ اللہ ان کے نام کی بدولت ان کے واسطے کی وجہ سے بارشیں نازل کر رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر راستے سے خدا کو پایا جا سکتا ہے۔

بادشاہ بھی ولی اللہ ہوسکتا ہے-شجاع کرمانی رحمہ اللہ کا واقعہ

مثال کے طور پر کرمان کے بادشاہ ''حضرت شجاع کرمانی'' دیکھیے، یہ کرمان ایک بستی ہے، حضرت شجاع اس بستی کے بادشاہ تھے اور ساتھ ہی بہت بڑے اللہ کے ولی تھے، ان کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ وہ مسجد تشریف لائے، نماز پڑھنے کے بعد دیکھا کہ ایک طالب علم نماز پڑھ رہے ہیں، بڑے خشوع کے ساتھ، بڑے اطمینان کے ساتھ اور ایسی اچھی نماز کہ انھوں نے خال خال ہی کسی کو ایسا نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ تو ان کا دل اندر سے کہنے لگا کہ یہ طالب علم جو نماز پڑھ رہا ہے، اتنی شان دار نماز، یہ اس قابل ہے کہ میں اس کو اپنا داماد بنالوں، انھوں نے مال نہیں دیکھا، انھوں اس کی دنیوی حیثیت نہیں دیکھی، اس کا حسب ونسب نہیں دیکھا، اس لیے کہ ان چیزوں سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو شیخ کرمانی کے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں اس کو اپنا داماد بنالوں، وہ طالبِ علم نماز سے فارغ ہوا، تو انھوں نے اپنے وزیر سے کہا کہ اس طالبِ علم کو بلا کر لاؤ، وزیر نے جا کر اس کو بلایا، وزیر کے بلانے پر وہ بے چارہ کانپ گیا کہ بادشاہ بلا رہے ہیں، پتہ نہیں کیا بات ہے؟ اب وہ آیا ڈرتے ہوئے، کانپتے ہوئے کہ معلوم نہیں میرے سے کیا خطا ہوگئی، لغزش ہوگئی ہوگی یا معلوم نہیں کہ کیا سوال کر لیا جائے اور میں جواب دے سکوں کہ نہ دے سکوں؟ جب وہ حاضر ہوا، تو بادشاہ نے اسے بٹھایا اور بٹھانے کے بعد کہا کہ میں تم سے ایک

بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ میرے دل میں یہ خواہش گزری کہ میں تم کو اپنا داماد بنالوں، تمہاری اگر شادی نہیں ہوئی ہے، تو تم اگر شادی کرنا چاہو، تو میری لڑکی سے شادی کرلو۔ بس جناب! یہ سننا تھا کہ ان کا دماغ چکرانے لگا؛ اس لیے کہ باشادہ کی بیٹی کو یہ فقیر شادی کر کے کیا کرے گا؟ کہاں رکھے گا؟ کیا کھلائے گا؟ کیسے اس کی خواہشات پوری کرے گا؟ اسے ہوسکتا ہے کہ دن میں پچاس جوڑوں کی ضرورت ہو، اب بے چارہ چکر میں آ گیا، ہاں کہوں تو مشکل، نہ کہوں تو بھی مشکل، ہاں کہنے میں یہ مصیبت، نہ کہنے میں یہ کہ بادشاہ کہیں ناراض ہو جائے کہ میری طرف سے یہ پیغام دیا جارہا ہے اور تو ٹھکرا رہا ہے؟

بالآخر اس نے قبول کرلیا، اس کے بعد شادی کا وقت آیا، شادی ہوگئی، شادی ہونے کے بعد رخصتی ہوئی، یہ اپنے جھونپڑے میں لے گیا شہزادی کو اور کھانے پینے کا مختصر انتظام ایک دو وقت کے لیے اس نے بنا رکھا تھا، جب کھانے کا وقت آیا تو میاں بیوی کھانے کے لیے بیٹھے، شرما شرمی میں کچھ زیادہ نہیں کھایا گیا اور کچھ کھانا بچ گیا، اس طالبِ علم نے اپنی بیوی سے جو کہ شہزادی تھی کہا کہ اس بچے ہوئے کھانے کو اُٹھا کر رکھ دینا، صبح ہمیں ناشتے میں کام آئے گا، اس نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور رونے بیٹھ گئی، اب رو رہی ہے، رو رہی ہے، طالبِ علم بہت پریشان کہ آخر کیا ماجرا ہے؟ اس نے اس سے بار بار پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کیوں روتی ہو؟ مگر اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا، یہ کہنے لگا کہ میں نے تمہارے والد سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں آپ کی بیٹی کو کیسے سنبھالوں گا، میری جھونپڑی اسے کیسے پسند آئے گی، میری رہائش کا انداز اسے کیسے پسند آئے گا، میرا سوکھا موکھا کھانا اسے کیسے پسند آئے گا؟ لیکن آپ کے والد نے بڑی غلطی کی کہ میرے سے آپ کی شادی کردی اور آپ کے تمام جذبات اور تمام خواہشات کو انھوں نے بالکل پیس کر رکھ دیا، یہ آپ کے والد

کی غلطی ہے، میری غلطی نہیں ہے، شاید تم کو میرا یہ جھونپڑا اور یہ سوکھا کھانا پسند نہیں آیا ؛اس لیے رو رہی ہو؟ شہزادی نے کہا کہ میں اس لیے نہیں رو رہی ہوں کہ مجھے جھونپڑے میں رکھا گیا یا سوکھا کھانا کھلایا گیا؛ بل کہ اس لیے رو رہی ہوں کہ میرے والد نے مجھے یہ کہا تھا کہ میں ایک متقی پرہیزگار اور اللہ والے سے تیرا رشتہ کر رہا ہوں، جو توکل علی اللہ کی دولت سے مالا مال ہے؛ لیکن میں نے یہاں پر آ کر آپ میں توکل نہیں دیکھا، آپ کہہ رہے ہیں کہ کھانا اٹھا کر کل کے لیے رکھو، جس خدا نے آج آپ کو دیا، وہ کیا کل نہیں دے سکتا؟ اس لیے مجھے رونا آ رہا ہے۔

اللہ اکبر!! آپ سوچیے کہ وہ بادشاہ کیسا ہوگا اور بادشاہ کی بیٹی پر اس کی تربیت کیسی ہوگی؟ اس کا اندازہ کچھ دیر کے لیے آپ کرنا چاہیں، میں سمجھتا ہوں کہ صحیح طور پر نہیں کر پائیں گے، بادشاہ کا جو انداز ہوتا ہے، اس کے پاس جو طاقتیں ہوتی ہیں، جو چیزیں ہوتی ہیں، اس کے اندر دینی غیرت ایسی، توکل ایسا، اللہ سے تعلق ایسا پیدا کرنے کی اس نے اگر کوشش کی ہے، تو کیا کیا نہ کیا ہوگا؟

معلوم ہوا کہ ایک آدمی بادشاہ ہوتے ہوئے خدا کا ولی ہو سکتا ہے، شہزادی خدا کی ولی ہو سکتی ہے، شہزادہ خدا کا ولی ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے ہزار راستے ہیں، کروڑوں ہیں، جس راستے سے چاہے آدمی پہنچ سکتا ہے، کوئی چیز اسے اللہ تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی، جیسا کہ آپ کو یہ مثالیں بتا رہی ہیں۔

سب کچھ کریں؛ مگر دل اللہ سے غافل نہ ہو!

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں اس طرح رہتے تھے کہ کوئی دور سے دیکھنے والا یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آپ اتنے بڑے جلیل الشان خدا کے نبی ہیں، بالکل معمولی سا انداز ہوتا تھا، آپ گھر کا

کام بھی کرر ہے ہیں، کبھی جھاڑو بھی دے رہے ہیں، کبھی چولہا بھی پھونک رہے ہیں اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں، بیویوں کے ساتھ ہنستے، بولتے بھی ہیں، مزاح وتفریح بھی ہورہی ہے، اپنے گھر کے اورافراد کے ساتھ بھی بات چیت ہورہی ہے، اس کے بعد کہتی ہیں؛ لیکن جوں ہی اذان ہوجاتی، تو آپ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل جاتا، اذان ہوتے ہی ایسا معلوم ہوتا کہ آپ ہم کو پہچانتے ہی نہیں ہیں۔
(تلخیص من :بخاری: ۵۶۹۲،ترمذی: ۲۴۸۹،مسند احمد: ۲۵۷۵۱، صحیح ابن حبان: ۱۲/ ۴۹۰)

اس طرح ہمیں بھی زندگی کرنا چاہیے کہ دنیوی کاروبار کے وقت اس کو کیا جائے؛ مگر خدا سے غافل نہ ہوں، نماز سے، قرآن سے، ذکر وتلاوت سے کسی سے غافل نہ ہونا چاہیے۔

اسی کو بزرگوں نے کہا اور نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں میں ایک اصطلاح ہے، ''خلوت در انجمن'' لوگوں کے درمیان میں انجمن میں بیٹھے ہیں، مجلس میں بیٹھے ہیں؛ لیکن تب بھی خلوت میں ہیں، لوگوں سے بات چیت ہورہی ہے، دل اللہ کی طرف لگا ہے، لوگوں سے میل ملاپ ہورہا ہے؛ لیکن دل کا تعلق اللہ سے قائم ہوگیا ہے۔

اس کو کہا قرآن نے کہا:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِاللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ﴾

ایک دربان کا مقامِ ولایت-عبداللہ حاجب رحمہ اللہ کا واقعہ

اسی طرح ایک واقعہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک آدمی جنگل سے گزر کر شہر کی طرف آرہا تھا، تو ایک بوڑھے سے ملاقات ہوئی، تو ان بوڑھے صاحب نے اس

سے پوچھا کہ آپ کہاں جارہے ہیں؟ تو کہا کہ میں شہر کی طرف جارہا ہوں، تو کہا کہ اچھا دیکھو اگر فلاں محلے میں آپ کا جانا ہو، تو ''عبداللہ'' نام کے ایک صاحب فلاں جگہ پر رہتے ہیں، ان کو ''عبداللہ حاجب'' کہتے ہیں، وہ ایک رئیس کے دربان ہیں، ان سے میرا اسلام سنا دینا۔

جب یہ صاحب اس محلے میں آئے، تو ان کو یاد آیا، تو انھوں نے تلاش کیا کہ یہاں عبداللہ حاجب کون ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا کہ فلاں جگہ پر رہتے ہیں اور ایک امیر کے دربان ہیں، دربان کیا؟ گیٹ کیپر (GATE KEEPER)، کوئی بڑا عہدہ نہیں ہے۔

اب وہاں پہنچے اور ان کو جا کر کہا کہ میں فلاں جگہ سے فلاں دن آرہا تھا، راستے میں ایک بزرگ شخصیت سے ملاقات ہوئی، انھوں نے آپ کو سلام بھیجا ہے، عبداللہ حاجب نے ''وعلیک وعلیہ السلام'' کہا۔ اس کے بعد اس آدمی نے پوچھا کہ وہ بزرگ کون تھے، جو آپ کو سلام سنا رہے تھے؟ تو عبداللہ حاجب نے کہا کہ آپ کو اس سے کیا غرض ہے؟ مگر وہ آدمی اصرار کرتا رہا کہ بتا دیجیے؛ کیوں کہ ان کا چہرہ بہت نورانی تھا، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی شخصیت ہے۔

تو انھوں نے کہا کہ وہ اصل میں حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اس آدمی کے دل میں آیا کہ حضرت خضر علیہ السلام خصوصیت کے ساتھ اس آدمی کو سلام کیوں بھیج رہے ہیں؟ جب کہ اس شہر میں اتنے لوگ ہیں، مسجدوں کے امام بھی ہوں گے، اور مدارس کے معلمین ومدرسین بھی ہوں گے، بڑی بڑی خانقاہوں کے شیوخ بھی ہوں گے، علما ومفتیان بھی ہوں گے؛ لیکن ان سب کو چھوڑ کر حضرت خضر علیہ السلام اس کو کیوں سلام پہنچا رہے ہیں، وہ بھی ایک دربان کو، کیا بات ہے؟

تو اس نے پوچھا کہ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر حضرت خضر عَلَیْہِ السَّلَام آپ کو خصوصیت کے ساتھ سلام کیوں سنائے ہیں؟ تو وہ صاحب کہنے لگے کہ بس ہمارا اور ان کا ایک تعلق ہے؛ اس لیے انھوں نے سلام کہا ہے۔

اس آدمی نے کہا کہ کیا آپ کوئی مخصوص عمل کرتے ہیں؟ تو عبداللہ حاجب نے کہا کہ کسی بھی کام میں لگتا ہوں، تو میرا دل خدا سے غافل نہیں ہوتا؛ پھر انھوں نے اپنی تفصیل سنائی کہ صبح اٹھتا ہوں، اس کے بعد یہ کرتا ہوں، اس کے بعد یہ کرتا ہوں، اس کے بعد امیر کے پاس جاتا ہوں، اس کی یہ خدمت کرتا ہوں اور یوں رہتا ہوں؛ لیکن جو کچھ بھی کرتا ہوں، خدا سے کبھی دل غافل نہیں ہوتا ہے۔

یہ ہے وہ بات جس کو قرآن کہتا ہے ﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ ایسے مرد ہیں، عجیب وغریب مرد کہ سب کچھ کرتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود تجارت اور خرید و فروخت ان کو اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی، ایسے بندوں کے لیے اللہ کے نزدیک خصوصیت کا مقام ہے۔ تو اس لیے ہمیں کسی بھی راستے کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے ذریعے ہم اللہ کے راستے میں چلنے سے فیل ہو جائیں گے۔ تاجر اپنی تجارت کے ذریعے اللہ کو پا سکتا ہے، ملازم اپنی ملازمت کے ذریعے اللہ کو پا سکتا ہے۔ دو واقعات میں نے آپ کو سنائے، پہلے واقعے میں تاجر کا قصہ آیا ہے، دوسرے واقعے میں ملازم کا قصہ آیا۔

معلوم ہوا کہ کوئی شخص ملازمت کرتے ہوئے بھی خدا تک پہنچ سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی تاجر تجارت کرتے ہوئے اللہ کو پالے، یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ دنیا کے کاروبار کو چھوڑیں، تبھی آپ اللہ تک پہنچ سکتے ہیں، یہ بات بالکل غلط ہے اور ذہن میں اس طرح کی بات لانے سے ہو سکتا ہے کہ شیطان کسی اور راہ پر

ڈال دے۔ کسی بھی راستے پر اللہ نے آپ کو لگایا ہو، جائز طریقہ ہو، اس کے ذریعے آپ اللہ کو پا سکتے ہیں۔

یادِ حق اور کاروبار کا اجتماع ممکن - ایک واقعہ

فرمایا کہ ہاں! یہ سوال یہاں پیدا ہوتا ہے کہ ہم کاروبار میں، ملازمت میں اور دنیوی کاموں میں رہتے ہوئے بھی کس طرح اللہ کو یاد رکھ سکتے ہیں؟ اکثر لوگ ان دو باتوں میں تضاد سمجھتے ہیں؛ مگر ان میں کوئی تضاد نہیں، میں اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں اس سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے بچپن کا واقعہ ہے کہ میسور میں جو مہاراجہ گزرا ہے اس کا محل اب تک موجود ہے، مشہور ہے اور بڑا عالیشان ہے، واقعی بہت شان دار ہے، شاید پرانے محلات میں سے یہی ایک محل ایسا باقی رہ گیا ہے، جو شروع سے اخیر تک محفوظ ہے، ورنہ تو سب کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں، بہت زمانہ پہلے بچپن میں ایک بار ہم لوگ وہاں گئے، میرے ساتھ اور بھی کچھ لوگ تھے، تو وہاں یہ بتایا گیا کہ اتوار کو یا ہفتے کے دن پورے محل کے لائٹ، جو اس کے اوپر ڈیکوریشن (DECORATION) کے طور پر لگائے گئے ہیں، پورے کے پورے ایک ہی وقت میں جلائے جاتے ہیں اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے محل کو ایک دم آگ لگ گئی، ایک دم ایک ہی سکنڈ میں پورا محل روشن ہو جاتا ہے، ہزاروں ہزار لائٹس اس کے پورے محل کے اوپر لگائے ہوئے ہیں اور سب کے سب ایک دم سے جلائے جاتے ہیں۔ اس کو دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ آ کر بیٹھے ہوئے تھے، تو ہم لوگ بھی چلے گئے اور ایک طرف کو بیٹھ گئے، تو جو حضرات ہمارے ساتھ تھے وہ کچھ کھانے کے لیے بھی لائے اور ہم لوگ کھا بھی رہے تھے اور کچھ باتیں بھی کر رہے تھے؛ لیکن اس کے باوجود دل دماغ اُدھر ہی لگا ہوا تھا، کہ وہ

لائٹ اب جلیں گے، تب جلیں گے، اس لیے کہ وہ لمحہ ایک ہی لمحہ آتا ہے اور وہ لمحے ہی میں دیکھنے کا ہوتا ہے، جلنے کے بعد تو سبھی دیکھتے رہتے ہیں، وہ دیکھنے کا نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جلتے وقت کیسا جلتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا کہ یہ پورا محل آگ ہی ہے، اسی وقت اسی سکنڈ میں دیکھنا ہے، یہ سکنڈ گزر گیا تو پھر ایک ہفتے کے بعد میں وہ سکنڈ آئے گا، اس لیے کھاتے پیتے، کام کاج کرتے، بات چیت کرتے ہوئے بھی دماغ ادھر ہی لگا تھا۔

اس سے ایک بات کی جانب ذہن منتقل ہوگیا اور یہ بات معلوم ہوئی کہ جو بزرگانِ دین کہتے ہیں کہ دنیا کا کام کرتے ہوئے بھی اللہ کی طرف توجہ ہوسکتی ہے، وہ دراصل ایسے ہی ہے کہ کھانے پینے میں، باتوں میں مصروف ہونے کے باوجود دماغ ادھر ہوا لگا ہوا ہو۔

بھائیو! اسی طریقے پر اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اللہ کی طرف توجہ ایک آدمی کے دل میں اگر رسوخ پکڑ جائے تو دنیا کا کوئی کاروبار اور دنیا کی کوئی چیز اسے غافل نہیں کرسکتی۔ یہ مضمون ہے اس کو آپ ذہن میں لے جایئے اور اپنے کاروبار کرتے ہوئے، اپنی ملازمت کرتے ہوئے، اپنی تعلیم کرتے ہوئے اور دنیا میں مختلف اپنے کام و کاج میں لگتے ہوئے، بیوی بچوں میں رہتے ہوئے، گھریلو کام کرتے ہوئے، کسی بھی چیز میں یہ نہ سوچیے کہ یہ اللہ سے ہم کو غافل کرنے والی ہے؛ بل کہ یہ سب چیزیں ہمارے لیے اللہ کے کام میں معین اور مددگار ہوسکتی ہیں، اس کے ذریعے اپنے آپ کو خدا تک پہنچانے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

نتیجۂ فکر: حضرتؒ مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب شعیبؔ مفتاحی دامت برکاتہم

زمانے کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں ☆ یہ سب ہم اُنہیں کا کرم دیکھتے ہیں

غلاموں کو شاہی کی عزت ملی ہے ☆ غلامی کا صدقہ یہ ہم دیکھتے ہیں

کبھی کیف و مستی کبھی قبض و وحشت ☆ سبھی میں رُموز و حِکم دیکھتے ہیں

مَرَض ہو یا صِحّت، اَلَم ہو یا راحت ☆ مشیّت پہ سب ہی کو خم دیکھتے ہیں

مقامِ ولایت جنھیں مل گیا ہو ☆ نہ خائف وہ ہوتے، نہ غم دیکھتے ہیں

ترے عشق کا غم جنھیں مل گیا ہو ☆ دلوں میں وہ لطفِ حَرَم دیکھتے ہیں

ترے نام کی لذّتیں پا گئے جو ☆ تجلّی تری دم بہ دم دیکھتے ہیں

شعیبؔ اُن سے اُن کے سوا ہم کیا مانگیں؟
کہ ہر شئ کو ہم کالعدَم دیکھتے ہیں
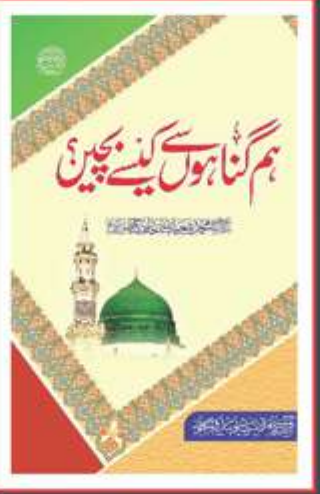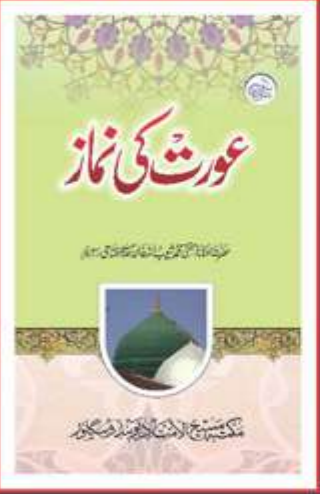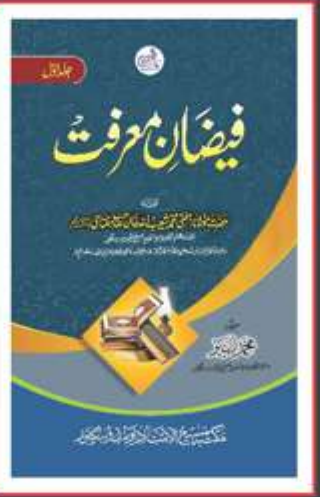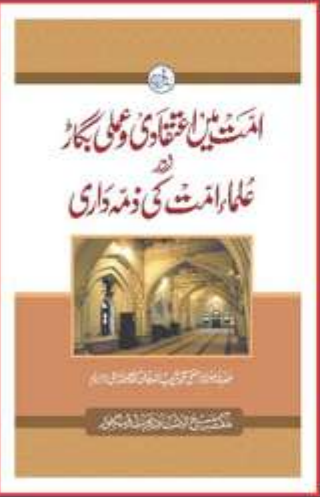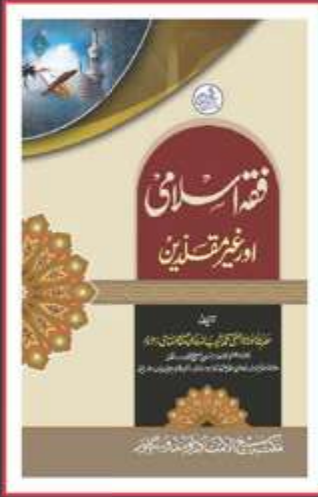
حضرت اقدس کی جملہ کتابیں مفت ڈاؤن لوڈ کرنے اور دیگر مزید گراں قدر معلومات کے اضافہ کیلئے ہماری ویب سائٹ پر وزٹ کیجئے۔

www.muftishuaibullah.com

MAKTABA MASEEHUL UMMAT DEOBAND
Minara Market, Near Masjid-e-Rasheed, DEOBAND - 247554
Mobile: + 91-9634830797 / + 91- 8193959470
MAKTABA MASEEHUL UMMAT BANGALORE
84, Armstrong Road, Bangalore - 560 001 Mobile : +91-9036701512
E-Mail:maktabahmaseehulummat@gmail.com